



مجموعتانی

چھوٹی مونی

چھوٹی مونی

عصمت چغتائی

کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی

طبع اول

جنوری ۱۹۵۲ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں

معنی امروہوی نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳
سے چھپوا کر کتب پبلشرز لمیٹڈ ریکل بلڈنگ لاہور بمبئی ۱ سے شائع کیا

ترتیب

۷	کہانی
۱۸	فسادات اور ادب
۲۷	ہوبیٹیاں
۵۲	بھبھئی سے بھوپال تک
۸۵	چوکتھی کا جوڑا
۱۰۵	کدھر جائیں
۱۲۱	کیڈل کورٹ
۱۳۶	پوم پوم ڈارلنگ
۱۵۵	جرٹیں
۱۷۲	سونے کا انڈا
۱۸۲	کچے دھاگے
۱۹۵	یہ بچے
۲۰۳	لال چوینٹے
۲۲۲	پھوٹی مونی

کسانی

پہلے زمانے میں ایک بادشاہ تھا..... پر اس نے زمانے
 میں بادشاہی کو ہونے کا حق حاصل تھا۔ معلوم نہیں رعایا وغیرہ کبھی ہوتی
 سکتی یا نہیں۔ ضرور ہوتی ہوگی ورنہ وہ بیچارہ بادشاہ پھر کس کا ہو سکتا تھا
 اور اس بادشاہ کے یا تو سات لڑکے ہوتے تھے اور یا صرف ایک، یا سات
 لڑکیاں ہوتی تھیں یا ایک اور اس بادشاہ کے سب سے چھوٹے یا سب سے
 بڑے لڑکے کو کسی حسین ترین شاہزادی کی جوتی یا آنجل دیکھ کر عشق ہو جایا کرتا تھا
 اب ظاہر ہے کہ رونی کپڑے کی فکر سے آزاد غریب شاہزادہ عشق کے سوا اور
 کر ہی کیا سکتا ہے۔ اس کا باپ بھی اسی طرح عشق میں بہتا رہتا تھا۔ کیونکہ اس کا
 دادا اس کے باپ کا بھی کفیل ہوتا تھا اور یوں ہی یہ کاروبار عشق اور معرفت
 خوری پشت پشت سے چلی آرہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی شہزادے پر کوئی نہایت
 عجیب و غریب قسم کی مصیبت نازل ہو جایا کرتی تھی۔ وہ درد و شجہ کے
 جوتے پر وہ ایک بھان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو جایا کرتا۔ وہ حسینہ

اس کا بڑا ناک میں دم کرتی۔ نہایت ڈھٹائی سے اسے چڑیا کے دودھ اور تلی کے انڈوں کی قسم کے کوئی شے لانے کا حکم دے دیتی اور وہ بیچارہ بغیر چون و چرا گھوڑے پر چڑھ کر چل کھڑا ہوتا۔ ایک دفعہ بھی تو اس اجنبی کے دل میں یہ خیال نہ آتا کہ یہ نیک بخت ان داہیات چیزوں کو مٹکا کر کیا کرے گی۔ کیوں خواہ مخواہ حیران کر رہی ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اس ابلہانہ ہم پر جانے کے عوض ہم دونوں محبت میں وقت گزاریں۔ مگر نہیں یہ وہ کیسے کر سکتا تھا اس کا باپ تو اس سے بھی زیادہ بے معنی چیزیں لا چکا تھا اور دادا بھی۔ یہ اس کی آبائی حقہیں شاید مجبور کر دیتی تھیں اسے۔

اب یا تو وہ وزیر زادے کو ساتھ لے لیتا جو سائڈ ہیر کی خدمت انجام دیتا اور اس کی کسی اور معشوقہ کی دوست یا وزیر زادی سے عشق لڑوانے کے کام میں لایا جاتا تھا یا کسی ضرورت سے زیادہ فرماں بردار خادم کو ساتھ لے جاتا جو موقع بہ موقع جاں نثاریاں دکھاتا رہتا۔

راستے میں اسے قسم قسم کی معشوقائیں ملتیں، ان میں بعض تو چڑیلیں ہوتیں جو جاوے سے عاشق صاحب کو سوراگھوڑا بنا دیتیں اور بڑی مشکلوں سے وہ پھر انسان کے قالب میں آتا اور بعض مصیبت زدہ ہوتیں جنہیں وہ آزاد کر کے چھوڑ جاتا۔ واپسی پر انہیں مال غنیمت کی طرح سمیٹا لاتا۔ جن اور اڑوھے بھی ملتے جنہیں وہ جان سے مار کر یا غلام بنا کر منزل مقصود پر پہنچ جاتا اور چڑیا کا دودھ اور تلی کے انڈے قبضے میں کر کے پلٹ آتا۔

لیجئے شہزادی بھی کھٹاک سے شہزادے پر عاشق ہو جاتی۔ معلوم نہیں

شادی کے بعد وہ چڑیا کے دودھ اور بلی کے انڈوں سے کیا کام لیتی۔ ہمیں تو اس سے بحث ہے کہ جیسے خدا نے ان دونوں کے دن پھیرے، ہمارے بھلاے نہیں پھیرتا۔ دنیا بدل گئی ہے۔ آہ وہ حسین نورانی دنیا — ستاروں سے میلوں آگے والی دنیا۔ اب کہاں؟ وہ کتابیں بھی تو اب کپڑے کھل گئے اور بادشاہ لوگ بھی کچھ ماند پڑ گئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان بیچاروں کے کتے لڑکے اور لڑکیاں ہیں اور انھیں عشق میں کیا کیا دکھ اٹھانا پڑتے ہیں۔ ہماری کہانیوں کے ہیرو کے پیر ہبکے اور ایک سیڑھی نیچے پھسل آیا۔ بادشاہی لٹ گئی اور صرف نوابی رہ گئی۔ خیر جی باپ دادا کا دیا ہوا اتنا بھی باقی رہا کہ عشق بے فکری سے کیا جاسکے۔ شہزادیاں نہ رہیں تو ان کی جانشین طوائفیں تو الودر رکھے موجود ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ طوائف کے مشاغل کو پیشہ کہتے ہیں اور نواب زادی کے پیشے کو روان ایک کور و پیہ کی ضرورت ہے، دوسری کو الودر نے دیا ہے۔ لہذا امید ان ضرورت مند کے ہاتھ رہا۔ اب ان نئی معشوقاؤں کے انداز بھی وہی رہے۔ انھوں نے تو چڑیا کے دودھ اور بلی کے انڈوں سے بھی زیادہ ٹیڑھی فرمائشیں کیں۔ انھوں نے کوہن کو کان زہ سمجھ کر سنہری روپلی نرس سوت لیں۔ وہ تیشے چلائے کہ سوت پھوٹ نکلی اور پھر حضرت عاشق سوکھی گائے کی طرح بھقان سے نکال دیے گئے۔

اور پھر دنیا کی قلابازیوں سے بدحواس ہو کر ہیروز میندار بنا۔ پھر لٹ بکھٹ کر سیدھا سا انسان رہ گیا۔ لوٹ پوٹ کر جب یہ ہیروز شہزادے سے انسان بنا تو بھی اس نے وہ اپنا پرانا پیشہ نہ چھوڑا۔ سولے عشق اور

دھند اسی کچھ نہیں۔ کوئی کہانی کوئی قصہ جب تک مکمل نہیں ہو سکتا جہتاک
 کہ میر کسی ہیر و من پر عاشق نہ ہو جائے۔ اگر وہ کلرک ہے تو مینجر کی لڑکی
 کے موٹر کی خاک بھانکے۔ اگر طالب علم ہے تو پروفیسر کی لڑکی یا اور کسی طالبہ
 علم کا دم چھلان بن جائے۔ مزدور رہے تو کلیٹھ کی بیٹی کی بانگی چتون کا سکا ہو جائے
 اگر بے روزگار رہے تو کمپنیوں کے مالکوں کی لڑکیوں پر فدا ہو کر اپنی ساری ناکامی
 کا الزام ان کے سر تھوپ دے۔ اگر گاؤں سدھار کو جائے تو زمیندار کی
 لڑکی پر مر مٹے۔ ملک کی خدمت کو جائے تو چھانٹ کر دشمنان قوم کی لڑکیوں
 سے آنکھ لڑائے۔ غرض عاشق ہونے کا پکا انتظام ہو ورنہ وہ ہیر و من بن
 سکے گا۔ عشق چونکہ اندھ ہے۔ اس کا بہت خیال رکھے کہ کہیں خدا نہ کرے
 عشق میں کامیابی آسانی سے نہ ہو جائے۔ عشق وہی زور دار ثابت ہوتا ہے
 جس میں معشوق کا عاشق کے گلے میں مستقل عذاب کی صورت میں لتاک جانے
 کا خدشہ نہ ہو ورنہ سارا عشق کرکرا ہو جائے گا۔ اگر مجبور دیرے کی طرح
 دم کے ساتھ ہو جائے اور ہر سال ایک وبال کا اضافہ کرنے پر تل جائے تو
 سمجھ لیجئے ہیر و منیت کے گلے پر کئی چھری پھرنی۔ اگر خدا نہ کرے یہ مصیبت ٹوٹ
 پڑے تو واجب ہے کہ ہیر و پھر کسی ناممکن سی جگہ عشق کرے ایسی لڑکی سے جو
 کسی صورت سے بھی اس کی زندگی میں نہ کو د سکے۔ وہ صرت عشق کرتا رہے
 اور یہی اُسے زیب و تیا ہے کیونکہ وہ ہیر و ہے اور ہیر و کے سینے میں دل
 ہوتا ہے تو اس میں سوائے سودائے عشق اور کیا کھوٹا جاسکتا ہے۔ یہ
 ساری دے دے عشق ہی کی تو ہے جس طرح دل کا شکل لبو تری سے چوٹھنی

نہیں ہو سکتی اسی طرح اس لمبوتری شے میں سولے جنونِ الفت اور کچھ نہیں سما سکتا۔

اور جب ہمیں عشق کا کانٹا مارے تو لازم ہے کہ بس اسی کی دھن میں سینہ کوئی کرتا، سر د آہیں بھرتا قدم مارتا چلا جائے۔ اسے قطعی اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ پل بھر کو بھی سوچے کہ وہ کس دنیا میں رہتا ہے اور کیوں رہتا ہے۔ اُسے جو تنخواہ ملتی ہے وہ زندگی کے جملہ ٹیکس چکانے کے لئے کافی ہے یا نہیں اور کیوں؟ اُسے تو بس دنیا کا سب سے بڑا ظلم یہی نظر آتا ہے کہ اس کی منظور نظر وقت ضرورت اس کی آغوش میں نہیں آتی۔ وہ اگر کنواری ہے تو اس کا کوئی کٹھننا سا رشتہ دار گنڈلی مارے اس کے گرد پہرہ دے رہا ہے۔ اگر شادی شدہ ہے تو اس کا نالائق اور ناکارہ، جی ہاں ناکارہ ہی ہوا کنبخت، شوہر دقت بے وقت آٹھپنے کی دھمکی دیتا ہے۔ اور اگر آزاد پیشہ ہے تو کنبخت جسم کو بھیچتی ہے مفت نہیں بانٹتی۔ بھاؤ تاؤ کرتی ہے۔ ندی نلے کی طرح ہر پیاسے کو سیراب نہیں کرتی اور اگر مفت لنگر بانٹنے کو تیار بھی ہو جائے تو گھر کی مالکہ طوفانِ بدتمیزی برپا کئے دیتی ہے۔ اگر گاؤں کی اٹھ چھو کری ہے تو کنبخت کے پیٹ میں بچہ رہ جاتا ہے جسے سماج بن بلا یا مہمان یا بنا پر مٹ کا غیر ملکی سمجھتی ہے۔ ایک مصیبت ہو تو کوئی ٹھگتے۔ اس سے تو کہیں سیدھے بچا رہے پرانے زمانے کے دیو بھوت ہوتے تھے کہ مہر و مرے سے بچنے کے ہاتھ دکھاتا انھیں بھونکوں سے اڑاتا چلا جاتا تھا۔ لیکن یہ آج کل کی مصیبتیں تو بس ہر قدم پر اڑنگا لگاتی ہیں۔

اب رہی ہیر و من۔ تو یہ وہی پرانے زمانے کے ایک بادشاہ کی کوئی
 سی لڑکی ہونی چاہیے۔ وہی جو اپنے عاشقوں کو متوجہ کرنے کے لئے جوتیاں اچھالا
 کرتی تھی۔ اس شاہزادی کا خوبصورت ہونا، اور جو کمبخت کافی کھڑی ہوئی تو شہزادہ
 اسے جوتے سے کھال اڑھڑ کر چلتا بنے گا، وہ بھی شہزادے کو جھری جھروکے
 سے دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی تھی۔ خود بے طرح عاشق ہو کر بھی وہ ظالم عاشق کو
 تنگنی کا ناچ پھا کر ہی قبولی دیتی تھی۔ ٹھنڈی آہیں بھرنے اور آنسو بہانے کے علاوہ
 اسے کچھ اور دوسری نہیں کرنی پڑتی تھی۔ یہ معشوق کا کردار تو بس آسانی سے
 بنا جا سکتا ہے۔ ذرا آٹھل لہرا دینا۔ آنکھوں سے از قسم تیر و تفتناک برسا دینا
 یا پھیل پھیل کر انگریزا بیاں لینا، سینے پر سے دوپٹہ پھیلا دینا اور دو چار کاما م
 لٹکے، بس کافی ہے۔ جب شہزادے کا راج پاٹ پھنا تو شہزادی بھی دنیا میں
 پھسل آئی، مگر حسن کی بجلیاں برابر کوندتی رہیں۔ زندگی کے ہر موڑ، ہر نکرے پر
 وہ اپنی رعنائیوں کا پٹا رہ لئے تاک میں کھڑی رہتی ہے کہ ہر آنے جانے والے
 پر دے مارے اور پھر جب دونوں طرف برابر آگ لگ جاتی ہے، مصائب اپنے
 بھین اٹھاتے ہیں۔ پہلے تو اس کے باپ بھائی ہی پرہ دیتے ہیں۔ پھر باق
 اس کے عاشق کا رقیب اسے بیاہ لے جاتا ہے اور عاشق مر مر کر دیکھتا رہ جاتا
 ہے یا کافی بھاگم بھاگ کے بعد عاشق ہی کا مہیا ب ہو جاتا ہے۔ اول الذکر
 حالات میں عشق خوب پروان چڑھتا ہے۔ ایسی مجنون، شیریں فرما د، ہیر
 راجھا والی بات رہتی ہے اور آخر الذکر حالت میں ہیر و ہیر و من و ہاں چلے
 جاتے ہیں جہاں سے کوئی بھی خبر نہیں آتی یعنی گھر گرہستی کے چکر میں سب

واؤ پیچ ختم ہو جاتے ہیں۔

ہیروئن کے لئے لازمی ہے کہ عشق کے لہکتوں مجبور ہو اور شادی کرتے وقت وہ سماج اور والدین کے سرسارا الزام منڈھ دے۔

ہیروئن کے لئے یہ بھی بہت ضروری ہے کہ وہ تعلیم یافتہ نہ ہو۔ کیونکہ تعلیم پا کر وہ نہایت خراٹ ہو جاتی ہے۔ وہ لٹکے بھی کچھ بھول بھال جاتی ہے عین موقع پر شر مارنے کی نظروں سے تیر برسانے میں قطعی فیصلہ، آخیل ڈھلکا کر سینے کا اُبھار دکھانے کا رتی بھر سلیقہ نہیں۔ نہایت کھڑی اور پکی ہوتی ہے اور جو کوئی ذرا جاندار ہوتی ہے تو وہ سخت بد معاش ہوتی ہے۔ بالکل طوائف کی سی باتیں اور وہ ہتھکنڈے، یقین نہ آئے تو فلم کمپنیوں کے ڈائریکٹروں سے پوچھئے۔ وہ آپ کو بتا دیں گے کہ تعلیم یافتہ لڑکی ہیروئن ہو ہی نہیں سکتی وہ کچھ ہو سکتی ہے تو وہی جو ایک ڈائریکٹر ہو سکتی ہے۔ ہیروئن کو صرف اتنا پڑھانا چاہیے کہ وہ عاشقانہ خط لکھ اور محبت نامے پڑھ سکے۔

لیکن سب سے زیادہ کارآمد ہیروئن وہ ہے جو آپ کو گاؤں میں ملتی ہے۔ نہایت اٹھڑ۔ آسانی کے لئے چولی پٹی اور اینگابسر میں لگا مفت میں لہٹا آجائے گا۔ اب وہ خواہ تیر نظر برسائے یا نہ برسائے سچی محبت کھٹ سے ہو جائے گی۔ اس کے باپ بھائی بھی مزید آسانی بہم پہنچانے کو ہل میں جتے رہتے ہیں۔ لہذا بڑے آرام سے ہمارا ہیروئن دی کے کنارے جا سکتا ہے۔ وہاں ہیروئن بکریاں چراتی مل ہی جائے گی۔ ہیروئن کو بکریاں اسی چرانا چاہیئے۔ عشق بازی کے لئے میدان اچھا ملتا ہے۔ مزے سے ادھر

بکریاں چر رہی ہیں۔ ادھر عشق چل رہا ہے۔ اب ہیر و چاہے تو اس جنگلی دوشیزہ کی تصویر تارنا شروع کر دے یا اور کوئی اس قسم کا بہانہ تراش لے۔ پیاس لے سر میں پتھر دھکر لگا لے یا اگر بہت زیادہ حقیقت پسند ہے تو دریا میں ڈوبتے ڈوبتے بچ جائے۔ بچنا اشد ضروری ہے ورنہ کہانی کی ابتدا المیہ ہو جائے گی ظاہر ہے کہ ہیر و دُن متوجہ ہوگی اور اس کا سر زانو پر رکھے گی۔ اس وقت وہ ہوش میں آکر اس پر فریفتہ ہو سکتا ہے۔ یا جب وہ اپنے دوپٹے کو بھپاڑ کر زخم پر بیٹی باندھے تو دوپٹے کی غلاظت سے سپٹاک ہونے کے خوف کو دبا کر اس کا ہاتھ واٹھ پکڑ لے اور پھر یقیناً اسے چرواہی کے سفید کبوتریوں کے سپر مومی انگلیاں اور گھسنی پلکوں کے دراز سایے، بازوؤں کی گولائی پر غور و خوض کرنے کا موقع مل جائے گا۔

اتنا واضح رہے کہ بھولی بھالی گاؤں کی دوشیزہ تو آپ کو ہندستان میں بھیڑ بکریوں کی طرح مل جائے گی۔ مگر بھول کر بھی بنگال کی طرف رخ نہ کیجئے گا وہاں کی دوشیزہ تو کال کی بھنبھوڑی چچوڑی ہڈی رہ گئی ہے۔ دھن کی طرف بھی نہ جائیے گا کیونکہ اناج کی ہنگامی نے وہاں کی دوشیزہ کو بھی چوس ڈالا ہے جرات ہمارا شٹر کی مچھیرن کے پاس بھی اس وقت عشق بازی کے لئے وقت نہیں ہے کیونکہ وہاں بھی غلے کی کمی نے اسے مکا کی روٹی کھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ تیل کی ہنگامی کی وجہ سے اس کے بال اب ناگوں کی طرح پھکڑا نہیں مارتے۔ اس کی پھیٹی چولی کے سوراخ میں سے مکھن میں گندھی ہوئی ٹوٹی کے عوض خایہ رخ زدہ ٹھٹھڑے ہوئے لٹھڑے نظر آتے ہیں۔ پنجاب سے بھی

اُپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ جو کچھ تھا وہ گلیوں سڑکوں پر چل کوئے اور گدہ کھائے
 کشمیر جہاں زعفران کے ہر ریشے کے ساتھ دوشیزائیں چلی آتی ہیں، اُپ
 انھیں چشموں کے کنارے حسن و عشق کی آنکھ مچولیاں کھیلنے کی فرصت نہیں، وہ
 تو عشق سے کہیں اوپچی کہیں زیادہ دلچسپ اور رنگین مقصد کے پیچھے دوڑ
 رہی ہیں اب انھیں آلوچے کے جھنڈ میں آنکھیں مارنے کی فرصت نہیں،
 کیونکہ نظروں کے تیرنیم کش کے عوض ہاتھوں میں رانفل اور لاکھٹیاں ہیں ہیر و
 سے کہہ دیجئے۔ ذرا سبفضل کے، یہ میدان عشق نہیں میدان جنگ ہے۔

زندگی ہے کہ طوفان بے تیزی۔ کوئی کیا کہانی لکھے؟ ہیر و منہ
 پھلائے بیٹھا ہے۔ آہیں بھر بھر کے اس کا سینہ دھوکنی کی طرح پھول گیا ہو
 کیونکہ پیٹ کا تور ٹھنڈا پڑا ہے۔ عشق تو دم دبا کر بھاگ چکا ہے اور زندگی
 نیم سبل کبوتر کی طرح پھر پھڑا رہی ہے۔ کہتے ہیں ایک دفعہ دمشق میں بھی ایسا
 کال پڑا تھا کہ عاشق و معشوق چو کر ٹی بھول گئے تھے۔ تو کیا ہندستان کا
 جذبہ عشق اس خون کی برسات سے دھندلا بھی نہیں پڑا ہوگا۔ ضرور پڑی
 ہوگی اس۔ جی تو ہیر و ایسا سنگدل ہو گیا ہے کہ لاٹھی چارج اور تنگی نے
 تیر نظر سے گھائل ہونے کی سکت ہی نہیں چھوڑی ہے، وہ اکتایا ہوا کہہ رہا
 ہے۔ اے دوشیزہ تمہارے ڈھلکے آنچل میری زندگی کو روندنی ہوئی چٹانوں
 سے نہیں ہٹا سکتے مجھے شراب الفت پلانے کی بجائے اصلی دودھ کی درگرم گرم
 چائے کی پیالیاں پلا دو تو بڑا گرم ہو۔ تمہارے اچھے ہوئے خشک بال سن کی
 رسیوں کی طرح میرے ننگے جسم میں چبھ رہے ہیں۔ انھیں سمیٹ لو۔ اس وقت

تک انہیں پریشان نہ کرنا۔ جب تک کہ یہ تیل پھیل سے ہلک نہ اٹھیں۔ ناز
 نخرے کم کرو۔ ہاتھوں کی ہندی چھڑا کر ذرا اس لڑاھکتی ہوئی چٹان کو
 سہارا دو۔

ہیروئن الگ بال بکھرائے ٹسوے بہا رہی ہے۔ بہت دن
 تک تم میرے حسن کے جھوٹے گمیتوں سے اپنے ہونٹوں کو آلودہ کرتے رہے
 اب میرے کان پاک گئے۔ سنتے سنتے تمھاری بکواس۔ تم جھوٹے ہو۔ تمھارا
 فلسفہ جھوٹا۔ میرے ہونٹ جھپٹیں تم گل برگ ترکھتے ہو۔ کانٹوں سے
 بھی زیادہ خشک ہیں۔ میں نے آج تک کسی پر نین بان نہیں چلائے۔
 کیونکہ میری آنکھیں تو بچپن ہی میں دکھ دکھ کر چندھیا چکی ہیں اور پلکین پٹال
 سے جھڑ چکی ہیں۔ میری پٹی چولی میں سے جھلکتے ہوئے نیم مردہ گوشت کو
 دیکھ کر ذہنی چٹخارے نہ لو۔ اس میں کھجلی اور جوڑوں نے گھاؤ ڈال دیے ہیں
 کہاں ہیں گدرا نارا اور کچے امرو۔ تین دن سے ننھا بھوک سے بل بلارہا
 ہے۔ نہ گاؤ میری عصمت اور تقدس کے فغے کہ میں سڑک کے بچوں بیچ
 دھن بن چکی ہوں مجھے عشق و محبت کی گھات میں جھروکوں میں نہ بٹھاؤ
 میرے ہاتھ میں ہلیچہ دے دو۔ ایک ہاتھ سے میں ننھے کا پنگورا اچھلاؤں
 گی اور دوسرے سے دھان کوٹوں گی۔ پھر بھی میرے لب تمھارے بوسوں
 کے لئے خالی رہیں گے۔ اس فکر میں کیوں گھلے جاتے ہو۔ ذرا ایک بار حسن
 و عشق کے بوسیدہ بسترے اٹھا کر مجھے اپنے پاس کھڑا تو کر لو۔ پھر دیکھنا۔ پھر بھی
 اگر آپ کو میرا یقین نہیں آتا تو کرشن سے پوچھئے کہ کیوں اس کی چمپا کلی سے

زیادہ نازک اور ہلکتی دوشیزہ "پشاور میل" بن کر وندنا نے لگی۔ اور کیوں
 اس کام گلا، روتا بسورتا مجنوں "تین غنڈے" بن بیٹھا۔ اور کیوں
 اس کے نظارے "پکار پکار کر کہتے ہیں کہ ہم وحشی ہیں" عباس سے پوچھے
 وہ بتا دے گا کہ کیوں اس کی ایک لڑکی "کی رعنائیاں" اجنتا "کی بے جان
 چٹانوں میں منجمد ہو کر رہ گئیں" سردار جعفری سے پوچھے کہ کیوں اس کا سر
 نئی دنیا کے سلام کو بے ساختہ جھک گیا۔

اور کیوں ہر قلم خون کے آنسو رو رہا ہے۔ کیوں کاغذ کا پرزہ پرزہ
 قرطالم سے لہزاں ہے۔ ہر اخبار اور رسالے کے سینے میں شعلے کیوں لپکا رہے
 ہیں اور کیوں ہر کتاب کے صفحات میں چنگاریاں دبی دبی سنگ رہی ہیں۔
 انسانیت شیطانت سے پٹ کر رو رہی ہے۔ حسن و عشق ایک
 دوسرے کی موت پر گلے مل کر ماتم کر رہے ہیں۔

تو میں کیسے کہانی لکھوں؟ کہانی کے لئے سالہ کہاں؟

فسادات اور ادب

فسادات کا سیلاب اپنی پوری خباثتوں کے ساتھ آیا اور چلا گیا مگر اپنے پیچھے زندہ مردہ اور ریتی ہوئی لاشوں کے انبار چھوڑ گیا۔ ملک کے ہی دو ٹکڑے نہیں ہوئے جسموں اور ذہنوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔ قد ریں بکھر گئیں اور انسانیت کی دھجیاں اڑ گئیں۔ گورنمنٹ کے افسر، دفاتروں کے کلرک مع میزکرسی قلم و قات اور رجسٹروں کے مال غنیمت کی طرح بانٹ دیے گئے اور جو کچھ اس بٹوارے کے بعد بچے ان پر فسادات نے درست شفقت پھیر دیا۔ جن کے جسم سالم رہ گئے ان کے دلوں کے حصّے بخرے ہو گئے۔ ایک بھائی ہندستان کے حصّے میں آیا تو دوسرا پاکستان کے۔ ماں ہندستان میں تو اولاد پاکستان میں۔ میاں ہندستان میں تو بیوی پاکستان میں۔ خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی کے بندھن تار تار ہو گئے، یہاں تک کہ بہت سے جسم تو ہندستان میں رہ گئے اور روح پاکستان چل دی۔

فسادات اور آزادی کچھ اس طرح گڈمڈ ہو کر وارد ہوئے کہ یہ قیاس لگانا

دستوار ہو گیا کہ کون سی آزادی ہے اور کون سا فساد۔ لہذا جس کے جتے میں آزادی
آئی فساد آگے پیچھے لائی۔ ایک بار ہی طوفان کچھ اس طرح بے کسے سنے وارد ہوا کہ
لوگ بستر پر یہ بھی نہ سمیٹ سکے۔ پر جب ذرا ٹھنڈک پڑی تو جملہ حواس جمع کر کے
چاروں طرف دیکھنے کا موقع ملا۔

جب زندگی کا کوئی نہ کوئی اس بھونچال کی غنایت سے تلبٹ ہو چکا تو یہ
کیسے ممکن تھا کہ شاعر اور ادیب الگ تھلگ بیٹھے رہتے، جب زندگی خون میں غلطان
ہو گئی تو پھر ادب جس کا زندگی سے چولی دامن کا رشتہ ہے کہاں تک ترو مہنی سے بچ
سکتا تھا، لہذا ہجر و وصال کے جھگڑے بھول بھال کر لوگ ہڈی پسلی کے بچاؤ کی فکر
میں پڑ گئے۔ شیطان کے چیلوں نے انداز دو چار ہاتھ انداز معشوقانہ سے بھی آگے نکل
گئے۔ پناہ گزینوں کے قافلوں نے قیس و فرہاد کی صحرا نوردی پر خاک ڈال دی
یہاں تک کہ غزل بھی جیسے جاگیر داری کی ناز پروردہ کہا جاتا ہے چوڑی بھول کر کوچہ
جاناں سے نکل بھاگی اور جلے ہوئے باناروں، لٹے ہوئے مکانات اور کھلی ہوئی
انسانیت کے انباروں میں بھٹکنے لگی۔ اس کے سوا چارہ بھی تو نہ تھا۔ آخر غم
جاناں کو ایک دن بڑھ کر غم دوراں ہونا تھا۔“

جوں ہی ادیبوں اور شاعروں کے ہوش و حواس درست ہوئے اپنے
مقصد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان میں مختلف خیالات اور جذبات کے حامی نظر
آتے ہیں۔ ترقی پسند بھی اور رجعت پسند بھی اور وہ بھی جو نہ ترقی پسند ہیں نہ رجعت
پسند۔ درمیان کا کوئی متممہ کچھ تو ان میں ایسے تھے جو گارامشی اور چونا لیکر فوراً
لیپ پوت پر ڈٹ گئے۔

نونی دیوار میں پھر سے اٹھائیں، شکستی پھتوں پر مستی ڈالی، مسمار ایوانوں
 کو نئے سرے سے سمیٹا۔ یہ ہوئے وہ جن کی تخلیقات کا مقصد تعمیر ہی تھا۔
 اس صف میں پیش پیش وہی نظر آتے ہیں جنہوں نے بدسی راج کے سایے میں جنم
 لیا تھا مگر اس سایہ سے عرصہ ہوا اکتا چکے تھے، جو اس بدسی حکومت کے ہاتھوں نالوں
 اس کے جلنے کی راہ دیکھ رہے تھے اور جیسے ہی انہوں نے دیکھا کہ سفید چٹری والے
 لیڈرے ہندستان سے چلے گئے، وہ ننھے بچوں کی طرح تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگے
 آزادی کے لشے نے انہیں الیاد ہویش کر دیا کہ وہ بزرگوں پر ناچتے گاتے، کو دتے،
 اچھلتے ذرا بھی تو جھپٹتے، ذرا بھی تو نہ شرماتے۔ اور شرمانے کی فرصت کسے تھی۔ یونین
 جیک نیچے پھیل رہا تھا، ترنگا اونچا ہو رہا تھا۔ اور وطن پرستوں کے دماغ ساتویں
 آسمان پر چڑھ گئے۔ سینما میں جیسے چونی والے، ہیر کو گھوڑے پر آتا دیکھ کر سیٹیاں
 بجا بجا کر ناچتے ہیں، بالکل اسی طرح یہ نشہ آزادی کے متوالے ترنگے ہیر کو عرش
 پر چڑھتا دیکھ کر گلی گلی کوچے کوچے نہچنے پھرنے لگے۔

”جھوم جھوم کر ناچو آج گاد من کے گیت“ پریم دھون نے گایا۔
 ”بڑھو کہ رقص و رنگ ہے، اٹھو کہ نو بہار ہے“ جوش صاحب گرجے۔
 ”بڑے نانے آج ابھرا ہے سورج۔ ہمالہ کے اونچے گلے گلے“
 جذبی نے بتیاب ہو کر کہا۔

اٹھلا کے چل موج چمن	اے رد گنگا گیت گا
رقصاں ہواے کوہ و دمن	ہاں اے ہمالہ جھوم جا
نغمہ سرا ہو، نغمہ زن	ہاں اے اجنتا کے بتو

’آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے ہندوستان۔‘ جاں نثار اختر نے جھوم

کر کہا۔

میری دلی، میری محبوب دلی
اب تو غاصب شہنشاہوں کی داشتہ اور خود کام جاگیر داروں کی نوٹھی
نہیں ہے۔

غیر ملکوں کے سرایہ داروں کی منہ سی نہیں ہے۔
تو ہماری امیدوں کا مرکز ہے خوابوں کی تعمیر ہے۔
آرزوؤں کی تصویر ہے۔

تیرے ہرے پہ میں آج اک نور ساد بکھتا ہوں جعفری نے

لکھارا۔

لیکن ۱۵ اگست بھی آیا تو ٹھہرنے کے لئے نہیں جانے کے لئے اور اپنے
پیچھے کھسپائے، روٹنے اور منہ بسورتے ہوئے انسانوں کا سیلاب چھوڑ گیا۔
گاتے دل خاموش ہو گئے، ناچتے پیر تھم گئے، جو رقصاں بھی رہے۔ وہ نہ جانے
کس تال سر کے بل بوتے پر چلے ہوئے دل سوچنے لگے اور سمجھنے لگے: مذہم ہوا یار
لوگ اپنی کا چاند کپڑا کر چل دیے جس کا لمع اتنا کچا کہ دو دن نہ ٹھہر سکا۔ جسے صبح
صادق جانا وہ صرف ایک پٹا نہ تھا جس کی عارضی روشنی میں بھولے دل ایک دم
جھوم اٹھتے تھے۔ جانے والے کس جالاک سے گئے کہ جسم لے گئے روح چھوڑ گئے اور
ستم ظریفی دیکھئے کہ آزادی کے دو ٹکڑے کر کے پکڑا گئے، کہنے کو کہہ دیا کہ ہندوستان
ہندستانوں کو پاکستان پاکستانیوں کو دے گئے۔ جب حساب کتاب کیا تو یہ پتہ

چلا جو کچھ ملا ہندستان کے سرایہ داروں اور پاکستان کے جاگیرداروں کو ملا
 جو ہاتھ پہلے خالی تھے، وہ اب بھی خالی ہیں۔ اندھے نے بائیں ریوڑیاں، اپنوں
 ہی کو دیتا چلا گیا۔ چنانچہ جوش صاحب بھڑک کر بولے
 "یہ بیونت یہ کتر۔ یہ کانٹ چھانٹ ابتری
 شنادروں کی ڈبکیاں مجاہدوں کی بے پری
 خزاں کہیں گے پھر کسے اگر یہی بہار ہے"

اور سردار جعفری نے دانت پس کر کہا:-

"کون آزاد ہوا؟"

کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی؟
 میرے سینے میں ابھی دروہے محکومی کا
 مادر ہند کے چہرے پہ اُداسی ہے وہی
 خنجر آزاد میں سینوں میں اترنے کے لئے
 موت آزاد ہے لاشوں پہ گزرنے کے لئے
 اور مجاز نے چپکے سے کہا:-

"یہ سب خون میں ہاتھ ہیں جن کے تر

یہی تھے میچا، یہی تھے خنجر"

ادھر سے احمد ندیم قاسمی نے اطلاع دی کہ یہاں بھی خیریت نہیں
 "روٹیاں بوتلوں سے تلمتی ہیں، عصمتوں کی سچی دکانوں پر
 پیٹ بھرنے کے بعد ناچتا ہے، خون کا ذائقہ زبانوں پر"

اور مجروح نے چڑھ کر کہا :-

”اب وہ غم زنداں دیتے ہیں جن کو غم زنداں ہونا تھا۔“
اور آخر نے بسور کر کہا :-

میں تو یوں خوش تھا کہ آزاد ہوا میرا وطن
..... مگر انہیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ -

ہاتھ لگتے ہی تو رنگ گل تر چھوٹ گیا
ہار گندھنے بھی نہ پایا تھا ابھی لوٹ گیا
جام لب تک بھی نہ آیا تھا ابھی پھوٹ گیا
میرے خوابوں کو نہیں کوئی مجھے لوٹ گیا

غرض ہر طرف سے لے دے شروع ہو گئی لیکن اس سے قبل کہ جواب دہی
کی طلب زور پکڑے ایک دم سے فسادات کا دھاوا پوری طاقت سے سر پہ چھوڑ
دیا گیا۔ صاف ظاہر ہے کہ حقوق کی طلبی سے دھیان ہٹا کر پہلے فسادات کی روک
تھام ضروری سمجھی گئی۔ ہندستان اور پاکستان کے بیشتر ترقی پسند اوسیب فوراً
اس طرف متوجہ ہو گئے اور دوسرے ترقی پسند عناصر کی ہمراہی میں کام شروع کر دیا
گیا۔ چا تو اور چھری کا وار قلم پر روکا گیا۔ گو رجعت پسندوں نے چاقو چھری ہی
کا ساتھ دیا مگر فتح ترقی پسند عناصر کی ہوئی۔ یہ ایسا وقت تھا جب جان کی قیمت
ایک مٹھی ریت ہو گئی تھی۔ شہر نارنجیوں کی بیکیں فوج کو نہتا میدان میں چھوڑ دیا
گیا تھا۔ ہر مطالبے کے جواب میں فساد کی آگ دہنی بھڑکا دی جاتی تھی۔ کرتا دھرتا
پیٹھ موڑے کھڑے تھے۔ مصلح قوم نہ جانے کہاں اونگھ رہے تھے۔ اس وقت

ادیبوں نے بالکل اسلحہ جات کی طرح ڈرامے، اسکیچز اور نظمیں تیار کر کے تیزی سے
فضا میں بکھیر دیں۔ احمد عباس نے اپنا ڈرامہ "میں کون ہوں؟" ڈیڑھ گھنٹے میں
بیچ کر گھسیٹ ڈالا، رمیرسل کیا اور اسی شام شہر کے کئی حصوں میں اسے پھیلا
دیا گیا۔ اس وقت عباس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہ تھی کہ اس جلد بازی
سے فن کو ٹھیس نہ لگ جائے، اس کے قلم کی مہتاب نہ ہو جائے، ایک ادیب
کی عظمت میں فرق نہ آجائے۔ اور اگر وہ یہ سب کچھ سوچ لیتے تو شاید میں کون
ہوں؟ "کون کا بہت کچھ مرقع بنا لیتے۔ مگر وہ اس آگ کے لئے پھینکا نہ بن سکتا
جو اس وقت بھڑک رہی تھی، اس بھڑکتی ہوئی دنیا کو شہ پاروں سے زیادہ چھٹیوں
کی ضرورت ہے۔

اسی زمانے میں کرشن چندر نے باقاعدہ ایک مضبوط مورچہ قائم کر کے فضاؤں
کہا بنوں، اور اسکیچز کی ایک فوج کی فوج میدان میں اُتار دی۔ جس تیزی سے فساد
پھیلے اسی تیزی سے کرشن کے افسانے ہندستان اور پاکستان کے رسالوں کے ذریعے
پھیل گئے۔ قصداً یا شاید انجانے طور پر یہ مہماری کچھ اس انداز سے کی گئی کہ دنیا
میں کہیں اور ایسی کوئی دوسری مثال نہ ملے گی، کہ ایک ہی ادیب نے دوا کی
خوراکوں کی طرح اس مختصر سے عرصے میں اتنا کچھ لکھا ہو اور نسخہ معین ثابت ہوا ہو
کرشن نے جو کچھ لکھا جذبات کی رد سے بچ کر سمجھ بوجھ کر اور شاید زبردستی
لکھا، آمد کا گلا گھونٹ کر آورد کو لبیک کہا۔ وہی لکھا جو اس نے لکھنا چاہا۔ جو
مصاحبت وقت نے کہا۔

یہ وہ وقت تھا جب دونوں فرقے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو چکے

تھے۔ ابھی گنتی تو ہوئی نہیں جو یہ پتہ چلے کہ کس پارٹی نے زیادہ شکار کئے۔ اگر مسلمانوں نے دو ہزار برہمنہ عورتوں کے جلوس نکالے تو ہندوؤں نے چار ہزار۔

مسلمانوں نے چھ ہزار

ہندوؤں نے آٹھ ہزار۔ — آٹھ ہزار۔ سولہ ہزار، بنیں ہزار سو ہزار۔ اب کوئی نیک بخت عقلمند ہوتا تو گن کر بتا دیتا کہ جیت کس پارٹی کے سورماؤں کو نصیب ہوئی؟ ویسے تو ہر جیتا ہوا شکست خور وہ سے بدتر نظر آتا ہے۔ سب ہی کے سر زمامت سے جھکے ہوئے ہیں ایسی حالت میں جو کچھ کرشن چندر احمد عباس، سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، اشاک، ساحر لدھیانوی، ہاجرہ مسرور اور اسی برادری کے دوسرے لکھنے والوں نے لکھا۔ اسے عزیز احمد، حسن عسکری اور ایم۔ اسلم ادب ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان لوگوں نے ترازو میں تول تول کر ہر وحشی کو برابر کا حصہ دیا ہے۔ حالانکہ ان کا خیال ہے کہ ظلم صرف ہندوؤں اور سکھوں نے کئے ہیں۔ پتہ نہیں وہ کس بنا پر ایسا کہتے ہیں۔ شاید ظالموں نے حساب کتاب کا رجسٹر ان کی خدمت میں پہنچا دیا ہے۔ ورنہ ہر عقتل رکھنے والا اندازہ سے ہی کہہ سکتا ہے کہ ظلم دونوں فرقوں نے کئے اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کئے، ان کی رے میں یک طرفہ تصویر ہی صحیح حالات کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کو بھی وہی کچھ لکھنا چاہیے تھا جو اس کی آنکھوں نے دیکھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو کیا ہوتا۔ اس زلمے میں جب کہ کرشن نے یہ افسانے لکھے۔ اس کا گھر مشرقی ممبئی میں تھا۔ مغربی پنجاب کے لٹلے

ذہنی اور جسمانی زخمی اور ان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر کون جانے کرشن کے دل
 میں مسلمانوں کے خلاف کتنا شدید جذبہ اٹھتا ہوگا۔ کسے معلوم ان خانہ بریاد
 عزیزوں اور پیاروں یہ بیٹھ کر اس کی حقیقت میں آنکھوں پر کتنی اندھیری
 چادر پڑ گئی ہوگی۔ مگر وہ کونسا جذبہ اور کون سی طاقت تھی جس کی مدد سے اس
 نے اس چادر کو چاک کر کے باہر بھاگنا۔ کئی بار یہ محسوس کر کے کہ وہ متعصب ہوتا جا رہا
 ہے۔ وہ اس فضا سے بھاگ نکلا ہوگا تاکہ اُن دیکھوں کی آہوں کی گرمی سے دور ہٹ
 کر تصویر کے دوسرے رخ کو اپنی تخیل کی نگاہ سے جنم دے۔ دھونڈ دھونڈا
 کر ایسی تصویریں جن میں یا تخلیق کیں جن کی نمائش کے وقت ترازو سے دونوں پلڑے
 برابر ہیں۔ اور اس وقت ہر شخص جسے اپنے لک سے پیار تھا۔ یہی کرتا جو کرشن نے کیا
 ترازو اٹھا کر ایک پلڑے میں چشم دید واقعات اور بیتے ہوئے حالات رکھے دوسرے
 میں تخیل کے کھینچے ہوئے نقشے۔ کوئی اور ہوتا تو ڈنڈی مار جاتا۔ یا ایم۔ اسلم کی طرح
 ایک ہی پلڑے کی ترازو لیتا۔ یا بقول عسکری صاحب نہ ظالم کو ظالم کہتا۔ نہ ظلم کی
 مذمت کرتا۔ نہ بدی کو رد کرنا پسند کرتا اور چند احمقانہ لطیفے لکھ کر اسی انتظار میں بیٹھ
 جاتا کہ انسان کی نیکی جو بدی کے ساتھ ضرور ہوتی ہے کب تہ سے اچھے اور سطح
 پر آئے اور پھر اُسے غیر فانی تخلیقی ادب کا رتبہ دے کر خراج تحسین کی اُمید کرتا
 میرے خیال میں خواہ کرشن چندر نے ادب کا گلا گھونٹا، فن کی نزاکتوں کو کچلا،
 مصنوعی ادب کو جنم دیا مگر وہ اپنے فرض سے غافل نہیں رہا۔ اس نے پروگنیڈا
 کیا اور مصلح بن بیٹھا۔ اس وقت جبکہ ہمیں فنکار سے زیادہ رہنما کی ضرورت تھی
 اس نے وہی کیا جس کی ضرورت تھی، مصلحت تھی حسن عسکری کی نظروں میں مصلح

اجتہاد ہوں گے چونکہ وہ خود مصالح بننے کی کوشش میں یہ سب کچھ ثابت کئے دے رہے ہیں۔ ہمیں حسن عسکری کی قدروں سے کوئی واسطہ نہیں ہمارے سامنے ان میٹ قدریں موجود ہیں۔ ہم انہیں پر نظر رکھیں گے۔

باوجود ان سب باتوں کے کرشن چندر اور دوسرے کسی لکھنے والوں نے جو کچھ بھی فسادات کے بارے میں لکھا وہ ادبی نقطہ نظر سے کسی طرح بھی نیچا نہیں "ہم وحشی ہیں" کا طرز بیان، پلاٹ اور پرواز تخیل کے معاملہ میں خود کرشن کے گزشتہ مجموعوں پر بھاری ہے، وہ سوز و گداز وہ چھین جو یہاں کے نظاروں میں نہ بھتی، شکست میں بھی نہ بھتی غرض سوائے "ان داتا" کے کہیں بھی نہ بھتی۔ حال ہی میں جو کرشن کی تحریروں میں آتش نشانی صنعت پیدا ہوئی ہے اور وہ صرف اس وجہ سے کہ ان تحریروں میں ایک لگن ہے، ایک مقصد ہے، ایک ارادہ ہے اور اس کی تکمیل ہے۔ اور یہی چیز ہے جس نے اسے اتنے بلند مرتبے پر پہنچا دیا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو سینہ کوٹ کوٹ کر فرقہ وارانہ ماتم کر رہے ہیں اور اپنی اس حرکت سے فطائی طاقتوں کی پیٹھ کھٹونک رہے ہیں۔ یہ جاگیر داری اور سرمایہ داری کے پھٹو عوام دشمن اور موقع پرست ہیں۔ ملک کے عوام کے وقت جو مال غنیمت ان کے ہاتھ آیا ہے اس کی حفاظت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ملک کے ٹکڑے ہوتے وقت جو کچھ ان کے ہاتھ لگا وہ عوام شاید ان کے حلق سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اس لئے فرقہ وارانہ ڈھونگ رچا کر ان کا ادھیان بٹانا چاہتے ہیں۔ یہ انگریزوں کے تربیت دیے ہوئے ان کے جانشین

ہیں جب کبھی ہندوستانیوں نے آزاد ہونے کی خواہش ظاہر کی اور فساد شروع کر دیے گئے اور اب انگریز چلے گئے (جسمانی طور پر) تو ان گدی پانے والوں کو اس نام ہندو آزادی کا پول کھلتا نظر آیا۔ ان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ مذہب کی آرٹے کر ملک کا بٹوارہ کر ڈالیں۔ نیز مرے پر سوڈرے آپس میں ایسے خون خرابے کرادیں کہ ایک عرصہ کے لئے متحدہ محاذ کا ڈر دور ہو جائے اور اس بٹوارے کو قائم رکھنے کے لئے ابدی مخالفت پیدا کرنے کی ضرورت ہے انھیں اصولوں کو مد نظر رکھ کر ایم۔ اسلم نے رقص الہی کی تخلیق فرمائی۔

لیکن رحمت پرستی کے علاوہ اس ناول میں نہ دم ہے نہ دلچسپی۔ انداز بیان نہایت بچکانہ اور بھس بھسا۔ کسی ایک بھی واقعے پر اصلیت کا دھوکا نہیں ہوتا کیونکہ شروع سے آخر تک ایک واقعہ بھی موثر طریقے سے نہیں پیش کیا گیا۔ کردار نہایت بوسیدہ اور بھونڈے ہیں۔ ساری ناول میں بس دو احمق قسم کے آدمی ٹوٹے پھوٹے مکالموں کے ذریعے سنی سنی اڑاتے ہیں۔ وہ بھی اتنی روکھی پھسکی طرح کہ جی اکتانے لگتا ہے۔ کتاب کا ہیردیسنی محبوب الہی جو مشرقی پنجاب میں سب کچھ لٹا کر ماں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے آیا ہے۔ جس کی ایک شب کی بیاہی وطن کو سکھ اٹھائے گئے ہیں، نہایت مزے سے چاق و چوبند صاف بستر، باقر خانیوں اور شکر وغیرہ کے بارے میں گفتگو کرتا ہے لیکن آخر میں اس کی اعوا شدہ وطن اسٹنٹ کوئن کی ہیردیسنی کی طرح سب کو مارتی پچھاڑتی صحیح و سالم بالکل پاک دامن لوٹ آتی ہے، پورے ناول میں ایک فرقہ کی طرف سے دوسرے فرقے کی سات پیڑھیوں کو کوسا ہے اور گالیاں دی ہیں۔

اگر کوئی دوسرا اس ناول کو اسی نظریے کے ماتحت لکھتا جس کا زور قلم
ایم۔ اسلم سے زیادہ ہوتا۔ تو واقعی یہ ناول خطرناک ہو سکتی تھی۔ لیکن یہاں تو اس
قسم کا کوئی اندیشہ نہیں۔

خیر ناول کو چھوڑیے اصل چیز تو اس کا دیباچہ ہے جو حسن عسکری صاحب
کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ پہلے ہی صفحہ کو پڑھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس ناول میں کیا
کچھ ہے اور کس بھدے طریقے سے ہے۔ ایم۔ اسلم حسن عسکری اور شاید عزیز احمد کے
سوا پاکستان میں کسی اویس بنے خواہ وہ ترقی پسند ہے یا نہیں رقص ابلیس کو نہیں سراہا
اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ رجعت پسندوں کا محاذ ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں
میں مضبوط نہیں۔

ایم اسلم کی چوٹ پر رامند ساگر نے بھی ایک ناول "اور انسان مر گیا"
لکھا۔ یہ دونوں ناول میں نے ایک ہی وقت میں دیکھے۔ تکنیک کو چھوڑ کر جہاں
تک مواد اور نظریے کا سوال ہے دونوں میں بڑی قریب کی مشابہت ہے۔ رامند
ساگر ترقی پسند نہیں تو رجعت پسند بھی نہ تھے۔ انہیں ایم۔ اسلم کے ساتھ ایک ہی صف
میں کھڑا کرتے مجھے بالکل ایسا ہی معلوم ہو رہا ہے کہ میں خود وہاں جا کھڑی ہوئی
ہوں کیونکہ رامند کو میں نے ہمیشہ اپنی برادری کا ایک فروگردانا اور یہاں انہیں
اور ایم۔ اسلم کو ہم خیال دیکھ کر دکھ ہوا۔

مثلاً "رقص ابلیس" میں ایم اسلم نے یہ دیکھ بیان کئے ہیں جو سکھوں اور
ہندوؤں نے مسلمانوں پر کئے۔

"اور انسان مر گیا" میں رامند ساگر نے وہ دیکھ بیان کئے جو ہندوؤں

اور سکھوں پر مسلمانوں نے کئے ہیں۔

ایم۔ اسلم کے یہاں بھی ایک سکھ موجود ہے جو مسلمانوں کی جان بچانے کو اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔

رامانند ساگر کو بھی ایک مسلمان مولانا مل جاتے ہیں جو یہی خدمت انجام دیتے ہیں۔

ایم۔ اسلم کی ہیروئن کو سکھ اٹھالے جلاتے ہیں اور

رامانند کی ہیروئن کو مسلمان۔

مگر یہاں ایم۔ اسلم نے رامانند ساگر سے زیادہ ترقی پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ جب ان کی ہیروئن خورشید پاکستان لوٹ آتی ہے تو اس کا شوہر اسے بغیر صفائی ہی کے قبول کرنے کو تیار ہو چکا تھا۔

رامانند ساگر کی ہیروئن جب لٹ لٹا کر ملیتی ہے تو وہ احمق ہیروئن کی سرور مہری سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لیتی ہے۔ رامانند ساگر ایک گری ہوئی عورت کو اٹھانے میں جھجکا گئے۔

ایم۔ اسلم کے یہاں خاتمہ بخیر ہے مستقبل ان کے اپنے خیال کے مطابق روشن ہے۔

رامانند ساگر کے یہاں یاسیت ہے، حماقت کی حد کو پہنچنی ہوئی ناامیدی ہے۔

ایم۔ اسلم کے کردار بچے کھچے جو رہ گئے ہیں وہ نئی زندگی شروع کر دیتے ہیں۔

رامانند ساگر کے کردار ذہنی اخلاقی اور جسمانی خودکشی کر لیتے ہیں۔ پائل

ہو کر لوگوں کو کلٹنے دوڑتے ہیں اور اسی برتے پر ہمدردی کے امیدوار نظر آتے ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ رقص ابلیس کا دیباچہ حسن عسکری نے لکھا ہے۔

”اور انسان مر گیا“ کا دیباچہ احمد عباس نے لکھا ہے اور اس میدان میں احمد عباس نے عسکری کی رحبت پسندی پر سبقت لے جانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

عسکری صاحب فرماتے ہیں ”رقص ابلیس“ ہی تخلیقی اور تعمیری ادب ہے۔

احمد عباس کہتے ہیں اندھیرے میں انھیں ایک ستارہ نظر آیا اور وہ رامند ساگر تھا۔ کیونکہ وہ سوچتا ہے انسان مر گیا۔ یہی انسان کے نہ مرنے کا ثبوت ہے۔

پتہ نہیں کس قسم کا فلسفہ ہے۔ شاید رامند ساگر اور احمد عباس ہی کی سمجھ میں آیا ہو کہ یاسیت ہی اصل رجائیت ہے جب رامند ساگر نے اپنے ناول میں ہر انسان اور حیوان کو مار ڈالا تو عباس قائل ہو گئے کہ موت ہی اصل زندگی ہے باقی سب حماقت ہے۔

عسکری صاحب فرماتے ہیں فسادات کے اصل ذمہ دار کھ ہیں اور ہندو مسلمان بیچارے تو صرف اپنے بچاؤ کے لئے کبھی کبھی مار بیٹھتے ہیں۔

احمد عباس کا خیال ہے کہ عوام ہی فساد کے ذمہ دار اور بانی ہیں۔ انھوں نے شوقیہ ایک دوسرے کا گلا کاٹا اور وہ بدسی حکمرانوں اور سامراج کے سالہا سال کے کئے دھڑے پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ وہ یہی سوچتے ہوں گے کہ اس قسم کے

کے ذمہ دار عوام ہی نے پاکستان مانگا تھا اور انہیں کوئل گیا۔

پاکستان اور ہندستان کے اس قسم کے لوگ اپنی ایسی تحریروں سے اس طبقہ کی پر وہ پوشی کرنا چاہتے ہیں جو ذاتی مفاد کی خاطر اس بٹوارے اور فسادات کا اصلی بانی ہے۔ یہ طبقہ کسی ایک ملک کی ملکیت نہیں بلکہ چند ملکوں کے سوا ہر حصہ زمین پر اس کے پنچے گڑے ہوئے ہیں اور اسی قسم کی حرکتیں کر کے اسی قسم کے بہانے اور حماقتیں ڈھونڈھ رہا ہے۔

مگر اس خوف زدہ یا نا اُمید نہ ہونا چاہیے۔ اس قسم کے ادب کو نہ ہی عوام نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور نہ ہی اپنا یا ہے۔ ممکن ہے وقتی طور پر عوام بہک جائیں۔ مگر ان ڈھول تاشوں سے انہیں زیادہ دن نہیں بھلایا جاسکتا۔

اس تعمیری اور تخریبی ادب کے درمیان اور کڑیاں بھی ہیں جن میں سے ایک تو وہ ہے جس کا انہماک ممتاز شیریں کے افسانہ "بھارت ناٹھ" میں کیا ہے۔

اس افسانے کا لب لباب یہ ہے کہ بھارت ماتا کے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ خوب ہوا پہلے تو اسے ذرا سی تکلیف ہوئی مگر پھر وہ قائل ہو گئی کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ یہاں انہوں نے ہندستان کو ایک ماں بتا کر لفظ ماں کو کیچڑ میں اوندھے مٹنہ گرا دیا ہے۔ بھلا ایسی بھی دنیا میں کوئی ماں ہوگی جس کا بچہ چیر کر دو ٹکڑے کر ڈالا گیا تو وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگی کہ آہا ہا ہا! دو دو ہو گئے۔ میرے دونوں بیٹے۔ یہ مثال نہایت

بھونڈی اور بھیا نک ہے۔ محترمہ سے میری درخواست ہے کہ اگر وہ خود ماں ہیں تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ بچے کے بارے میں ان کا اتنا مضحکہ خیز نظریہ ہے اور جو وہ اس تھمیلے سے آزاد ہیں پھر بھی کم سے کم وہ عورت تو ہیں جو ماں اور بچے

کے رشتے کی ایسی تضحیک کبھی برداشت نہیں کر سکتی اور اس کی درگت نہ بنائے گی۔ یہ نظریہ ویسے بھی بغیر اس مثال کے کچھ بے تکا سا ہے کہ اگر ایک چیز کے دو ٹکڑے ہو جائیں تو وہ زیادہ پھلے پھولے گی۔ سالم نہ پھل سکے گی۔ محترمہ ایک نہایت خوفناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں تقسیم کر دینے سے ممکن ہے دھارے کا زور دھیمّا پڑ جائے لیکن اگر اتفاق سے یہ دو ٹکڑے مل گئے تو پھر اس سیلاب کو کسی قسم کی روک تھام اور پیش بندی نہ روک سکے گی۔ وہ جراتیں جو اس بتوارے سے کمزور پڑ گئی ہیں اگر متحد ہو گئیں تو پھر کیا ہو گا۔ انھوں نے نہیں سوچا، مگر یہ میری غلطی ہے وہ خوب سوچ سمجھ کر باقاعدہ پردگرام کے مطابق یہ سب کچھ کہہ رہی ہیں۔ گو یہ بڑے مصنوعی حربے ثابت ہوں گے مگر فی الحال تو یہ ادب تخریبی ادب سے بھی زیادہ خوفناک ہے تخریبی ادب کا مقصد تو صرف توڑ پھوڑ ہے مگر یہ ادب پیڑ کی جڑ کو کھوکھلا کر کے اس میں نیا بیج ڈالنے کی سازش ہے، اگر یہ بیج جڑ پکڑ جائے تو انسان کو جھوٹی امید اور کھوکھلے وعدوں کے چکر میں پھنسا کر قوتِ ارادی کو کچل دیتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ منٹو کے ”یادِ حاشیہ“ ادب پاروں کی فہرست میں شامل کروں یا ان کے لئے کوئی نئی جگہ تلاش کروں منٹو کو عجیب و غریب تہلکہ ڈال دینے والی اور سوتوں کو چوکنے والی چیزوں سے بڑی رغبت ہے وہ سوچتا ہے کہ اگر بہت سے لوگ سفید کپڑے پہنے بیٹھے ہوں اور کوئی کچھڑا ل کر وہاں چلا جائے تو سب ہکا بکا رہ جائیں گے۔ سب لوگ روپیٹ رہے ہوں۔ وہاں ایک اونچا تہمتہ لگا دو تو سب کے سب دم سادھ کر ٹکر ٹکر منہ دیکھنے لگیں گے

بس دھاک بیٹھ جائے گی سیکہ جم جائے گا۔ اس حربہ کے ذریعہ سے منٹو نے بہت
 دفعہ لوگوں سے خراج وصول کیا ہے مگر اس دفعہ اس کا وار کچھ اوجھڑا پڑا۔ ویسے
 سیاہ حاشیہ، ادبی شہ پارے اور غیر فانی عجوبے نہیں تو بالکل کوڑا کبار بھی نہیں
 ان میں سے بہت سے ٹکڑے خوبصورت ہیں کہ پڑھ کر جی بھر آتا ہے لیکن دیباچہ
 نویس نے ان کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ انھیں غلط لباس میں پیش کیا ہے
 لباس اپنی طرف سے منڈھ دیا ہے۔ یہ کہہ کر منٹو ظالم کو ظالم نہیں کہتا، نہ جانے
 ان کا کیا مطلب ہے؟ کیا وہ سوچتے ہیں منٹو ظالم کو محبوب یا دلبر کہتا ہے۔ میرے
 خیال میں منٹو کبھی اس قسم کی باتیں نہیں کہتا۔ وہ سب کچھ کہہ سکتا ہے، یہ نہیں کہہ سکتا
 کہ شیطان طبع لوگ خود اپنی جدت میں یا خدا نے انھیں ایسا ہی بنایا ہے۔ معاشی اور
 اقتصادی اور سیاسی طاقتوں کا اس تعمیر میں ہاتھ نہیں، عسکری صاحب کا فلسفہ
 ہے کہ مارنے والوں کو منع نہ کرو وہ نہ مانیں گے۔ تو کیا ان کی رائے ہے کوئی سر پر
 ایک ٹھٹھا مارے تو اس سے کہیں گے بھائی چارہ اور مارے۔ یہ مقدس جذبہ عسکری
 صاحب میں ہو تو ہو کسی عقلمند انسان میں تو نہیں اور منٹو میں تو ہرگز نہیں۔ منٹو تو
 ایک بار سمجھائے گا۔ دوبار سمجھائے گا۔ تیسری بار اگر لاتوں کے بھوت باتوں سے
 نہ مانے تو لاتوں ہی سے سمجھائے گا۔ عسکری صاحب نے منٹو کا نظریہ مسخ
 کر کے پیش کرنے میں نہ جانے کیا لذت محسوس کی مگر یہ ہوا برا منٹو کے لئے
 منٹو سب کچھ ہو سکتا ہے متعصب نہیں ہو سکتا۔ کسی کے بنائے بھی نہ بنے
 گا۔ فساد پسند نہ بنے گا۔ وہ انسان جو دنیا کی ذلیل ترین ٹھکرائی ہوئی
 طوائف کے لئے اپنے قیمتی آنسو بہا سکتا ہے۔ جو دلائل جیسے رذیل

حیوان کے دل کو ٹوٹل سکتا ہے۔ جس کی حساس ناک عطر کی خوشبو کی متحمل نہیں ہو سکتی صرف اس لئے کہ اس خوشبو میں تصنع ہے، بناوٹ ہے۔ قریب ہے وہ لاشوں پر تہمتہ لگا کر نہیں اچھل کو دسکتا۔ وہ ظالم کو ظالم سمجھتے بھی نہیں ڈر سکتا، وہ فساد کو روکنے کیوں جھجکے گا۔ ہمیں کہیں دھوکا ہوا ہے۔ ہمارے آنکھوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کسی پوشیدہ مطلب کی خاطر منٹو کی تحریر کو آلہ کار بنایا گیا ہے۔ منٹو کا طرز تحریر کبھی کبھی اُلجھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ گھما کر کہنے کا عادی ہے مگر اتنا معلوم ہے کہ سیاہ حاشیے منٹو نے سنس کر نہیں لکھے اور منہانے کے لئے نہیں لکھے اور نہ ہی کبھی وہ رجوت پسند ادب لکھے گا۔ خواہ اس کو کتنے ہی بھانسنے دیے جائیں۔

یہ ہے اس ادب کی ایک جھلک جس نے فساد کے بجوں بیچ جنم لیا۔ اب یہ دیکھتا ہے کہ اس میں سے کیا کچھ غیر فانی بنتا ہے۔ اور کیا کچھ عطار کی دوکان پر پڑیاں باندھنے کے کام میں آتا ہے۔ یہ کہہ دینا پر بھنگامی ادب ہے اور اس بھنگامے کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت اور مقبولیت ختم ہو جائے گی غلط ہے۔ ہر زمانہ کا ادب بھنگامی ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے بھی وقت بھنگامہ جو کچھ لکھا وہ غیر فانی صورت اختیار کر چکا ہے۔ گورکی کی تحریروں کبھی ماند نہ پڑیں گی۔ حالانکہ جس بھنگامہ کے سلسلے میں اس نے لکھا وہ اس کے ملک میں ختم ہو گیا۔ مگر اس کا ایک ایک حرف اب بھی لوگ سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ تمام جو غلامی کی کریمہ رسم پر لکھا گیا۔ بھنگامی ہوتے ہوئے بھی لافانی بن گیا۔ سپن کی بغاوت ختم ہو گئی لیکن FOR WHOM THE BELL TOLLS کی عظمت قائم ہے۔

لہذا وہ لوگ جو فسادات پر کھٹے ہوئے ادب کو ہنگامی ادب اور وقتی
پر وگینڈا کہہ کر اس کی وقعت کم کرنا چاہتے ہیں وہ زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو خود
کچھ نہ لکھ سکے، یا شاید اس ادب کو اپنے مطلب کے خلاف پا کر اُسے گمنامی سے
درا کر میدان صاف کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کی فنا اور بقا۔ نفس مضمون اور ادیب
کی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ اس ادب کو وقتی ادب کہنا تنگ نظری کی دلیل
ہے۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہر ہنگامہ غیر فانی ادب پیدا کر سکتا ہے
مثلاً اگر کسی نواب صاحب کے لاڈلے کتے کی شادی پر سہرا لکھا جائے یا کسی کلٹر
صاحب کے تباوے پر شہر کے ہیڈ ماسٹر صاحب الوداعی مرثیہ لکھ دیں تو وہ بھی
غیر فانی ہو جائے گا۔ غیر فانی ادب کو پیدا کرنے کے لئے ایک حساس دل کی
ضرورت ہے اس طرف جہاں کی کوئی منزل ہو۔ ورنہ بقول شاعر
دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضمون کہاں
میں جسے چھو تا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

بہو بیٹیاں

یہ میری سب سے بڑی بھابی ہیں۔ میرے سب سے بڑے بھائی کی سب سے بڑی بیوی۔ اس سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میرے بھائی کی خدا نہ کرے بہت سی بیویاں ہیں۔ ویسے اگر آپ اس طرح سے ابھر کر سوال کریں تو میرے بھائی کی کوئی بیوی نہیں، وہ اب تک کنوارا ہے۔ اس کی روح کنواری ہے ویسے دنیا کی نظروں میں وہ بڑی بھابی کا خدائے مجازی ہے اور پون درجن بچوں کا باپ ہے۔ اس کی شادی ہوئی۔ دولہا بنا، گھوڑے پر چڑھا، دھن کو گھر لا کر پلنگ پر بٹھایا پھر پاس ہی خود بھی بیٹھ گیا، اور جب سے برابر بیٹھ رہا ہے۔ لیکن تصوف کی باتیں سمجھنے والوں ہی کو معلوم ہے کہ وہ کنوارا ہے اور صدا کنوارا رہے گا۔ اس کا دل نہ بیاہ سکا اور نہ کبھی بیاہ سکے گا، وہ نہ کبھی دولہا بنا نہ گھوڑے پر چڑھنا نہ دھن کو لایا نہ اس کے سنگ اٹھا بیٹھا۔ وہ تو اس کا باپ تھا جس نے اس کا بیاہ طے کیا۔ ایسے غیرے نتھو خیرے کی رائے سے وہ بغاوت کے بخار میں جھلتا رہا مگر چوں نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا۔ اس کے باپ کے ہاتھ بڑے

مگر رے ہیں اور جوتے اس سے بھی تگرے اس لئے اس نے بہتر سمجھا کہ وہ شہید تو ہو ہی رہا ہے جوتے سے شہید نہ ہو تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہذا وہ دولہا بنا اور سہرے کے پیچھے تارٹنے والوں نے تار لیا کہ ایک اور سہرا بندھا ہے جو اس کے ارمافوں کے خون میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے گوندھا گیا ہے جس میں اس کی نہ سنائی دینے والی سسکیاں پوری ہوئی ہیں۔ جس میں اس کے مسلے ہوئے جذبات اور کھلی ہوئی مسرتیں بندھی ہوئی ہیں وہ گھوڑے پر نہیں چڑھا۔ اس کی میت ماں باپ کی ہٹ دھرمی کے گھوڑے پر لکھا ہی گئی۔ وہ اپنی دھن نہیں لایا بلکہ وہ ماں باپ کی دھن تھی۔ ان ہی کی بیاہتا تھی۔

مگر ایک مجبور بیٹے کی طرح بنا آہ وزاری کئے وہ دھن کے پاس بھی گیا۔ اس کا گھونگھٹ بھی ہٹا یا مگر وہ یہی ارادہ کر چکا تھا کہ وہ خود و ماں نہیں، یہ اس کا باپ ہے جو اس دھن کا دولہا ہے۔ مگر چونکہ میری بھابی اس وقت بڑی نہ تھی۔ میرا مطلب ہے جسمانی طور پر وہ دہلی پتلی اور نازک سی چھو کری تھی، اس لئے ایک لمحہ کو میرے بڑے بھائی کا جسم اس سے بیاہ گیا لیکن بہت جلد ہی وہ دہلی پتلی عورت بڑھنا شروع ہوئی اور چند سال ہی میں وہ پھول پھال کہ بے تکے گوشت کا ڈھیر بن گئی۔ میرے بھائی نے اس کے اوپر چڑھتے ہوئے گوشت کو نہ رد کیا۔ اس کی جرتی روکتی۔ وہ اس کی تھی کون۔

لیکن وہ بچے..... اس کے ماں باپ کے بچے جنہیں وہ کبھی بھولے سے بھی نہ چھوٹا تھا وہیں بڑھتے رہے۔ نانکیں سرسڑاتے، میلی نانکیں اُچھلتے

وا دیا بچاتے مگر میرے بھائی کے دل کے درد اذیے ویسے ہی بند رہے
وہ ایسا ہی کنوارہ اور بانجھ رہا۔ میری بھابی کچھ ایسی ان مرحلوں میں پھنسی کہ
اس نے پلٹ کر بھی بھیا کی طرف نہ دیکھا۔ جانے کہتی ہوں، میں تو پہلے ساس
سُسر کی بہو ہوں، منذ کی بھوجانی ہوں، بچوں کی اماں ہوں نوکروں کی مالک
ہوں، محلے ٹوٹے کی بہو بیٹی ہوں پھر اگر وقت ملا تو بھاری بیوی بھی بن جاؤں
گی۔

بھیا کو اس طرح کی ساجے کی ہانڈی بڑی پھسکی سیٹی اور بے مزہ لگی اور اس
نے اپنا دل سنبھال کر اٹھایا۔ بکھرے ریزے سیٹے اور تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس
نے کتنے ہی آستانوں پر اس چکنا چور شیشے کے ٹکڑے کو جا کر رکھا، مگر کوئی ہم
کوئی دوا ایسی نہ ملی جو ان ریزوں کو جوڑ دیتی اس لئے وہ اب بھی اپنا کنوارا دل
لئے پھر رہا ہے کسی دل والی کی تلاش میں۔

اس نے دل والیوں کو رنڈیوں کے کوٹھے پر ڈھونڈا رگندی گلیوں میں گھومنے والی
کھپیاؤں میں تلاش کیا۔ ریڈیو اسٹیشنوں پر گلنے والی حدیناؤں اور آرٹسٹوں میں ٹولا۔
ہسپتالوں کی زروں میں بھی جستجو کی فلمی پر یوں کی گچھاؤں میں بھی بھٹکا اور اکسٹرا ریڈیو
کے جہر مٹ میں بھی جھانکا۔ جاہل گناؤں کی گنوار یوں، سڑک کی کوٹنے والیوں۔
مچھیر لوں اور بھٹیاریوں کے آگے بھی ہاتھ پھیلا یا۔ ڈرائنگ روم میں اگنے والی
اور بال روم میں ہتر کنے والی شریف زاد یوں سے بھی بھیاک مانگی مگر اسے دل والی کہیں ملی
لاکھوں ہی گھونگھٹ پٹ ڈالے مگر وہی عادت وہی ساس سُسر کی بہو وہی اُن کے ہی لال بچوں کی ماں دکھائی
میری بھابی سب سے بڑی سہمی، مگر زیادہ عقلمند ہرگز نہیں۔ اُس نے

میاں کو چھوٹے پہلا دے کبھی نہ دیے۔ جیسے پہلے ہی رات کو وہ سمجھ گئی ہو کہ اپنی جان گھسانا حماقت ہے ان تلوں سے تیل نہ نکلے گا اور وہ دنیا سے جی کر ڈا کر کے کالے کلوٹے، ٹیڑھے بھینگے بچے تو خود بخود اس کے پیٹ میں تعمیر ہوتے رہے وہ تو ابکائیاں لینے اور بد وضع بننے کے سوا کچھ بھی نہ کرتی رہی اور یہ بچے میرے بھیا سے انتقام لینے کا مفید آلہ ثابت ہوئے۔ جب ناک چلٹے۔ تنگ دھڑنگ بسورتے ہوئے کھینچوے کسی محفل یا پارٹی میں میرے بھیا کو چھو دیتے ہیں تو وہ ایسے اچھل پڑتے ہیں جیسے بچھو نے چٹک لیا ہو اور جب کبھی بھولے سے کوئی حق مہمان گھر میں گھر جاتا تو یہی تہذیب اور نفاست کے قاتل ادب اور سلیقہ کے دشمن اس کی چھاتی پر کودوں دل کر اس کو ڈوب مرنے کی ترغیبیں دیا کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ گھر کے میلے بچھو نے میلے فرش اور چھجلا ندے برتن ایک نفیس دماغ روح کو ابدی مرگھٹ میں سلگانے کے لئے کافی نہ پا کر میری بھابی نے جملہ ترکیبوں اور خوش گفتاریوں کے زین لسنچے استعمال کر کے آنے جانے یا مستقل رہنے کے شوقین رشتہ داروں کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا ہے۔

اسی لئے تو بیچارہ دل والی کی تلاش میں زر زمین لٹاتا پھرتا ہے۔ کبھی اسے کوئی محبوبہ و لنواز موقع پا کر اس کا فرینچر فروخت کر کے، مکان پرگڑی پر اٹھا کر حتیٰ کہ اس کے کپڑے بھی اپنے نئے عاشق کے لئے کر بھاگ جاتی ہے اور وہ پھر ویسا ہی لندورا اور یتیم رہ جاتا ہے۔

دیے بھی اسے عشق راس نہیں آتا جہاں کے لوگ آوارگی کرتے ہیں۔ پر

گھنٹیاں کسی کے گلے میں نہیں لٹک جاتیں۔ وہ تو اگر بھولے سے کسی کی طرف مسکرا کر بھی دیکھ لیا تو وہ عورت فوراً حائل ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جان پر ایک عدد تحفہ نازل کر دیتی ہے جسے وہ بلی کے گو کی طرح چھپاتا پھرتا ہے۔ وہ اپنے جائزہ بچوں سے ذرا نہیں شرماتا مگر اس کی علتوں سے اس کی عزت پر حرف آنے کا خوف ہے، وہ بڑا باعزت ہے نا۔

وہ اپنی اس مصیبت کو دنیا کی سب سے بڑی آفت سمجھتا ہے۔ جب اس کے دل کی دنیا جاڑ پڑی ہے تو لوگوں کو بھوک، مہنگائی اور بے کاری جیسی بے مہر چیزوں کے بارے میں کچھ سوچنے کا کیا حق ہے۔ دل ہے تو سب کچھ ہے۔

آپ سمجھیں گے کہ وہ کوئی حبسنی مرلیض ہے، عورت کا بھوکا ہے۔ جی نہیں اس ظالم عورت کی وجہ سے تو اسے بار بار بدقسم کی بدھنہی بھی ہو چکی ہے تو بات دراصل یہ ہے کہ وہ ایسے ماحول کی پیدائش ہے۔ جہاں غم و نیا کو غم عقبی کی آرٹ میں چھپانا سکھایا جاتا ہے۔ جہاں ہر جسمانی محرومی کا الزام نصیب کے سر اور روحانی تشنگی کا ٹھیکہ معشوق کے ذمے وہ قسمت کے پیچھے ڈنڈا لے کر پڑا ہوا ہے۔ ایک دن اسے نصیب کہیں دکھا ہوا مل جائے گا اور وہ اس کا سر پاش پاش کر دے گا پھر وہ ہوگا اور اس کی محبوبہ لیکن اسے اتنا بھی نہیں معلوم کہ اس کا نصیب اس کی پیٹھ پر بیٹھا ہے اور اس کی چربی چڑھی آنکھوں کو کبھی نظر نہ آئے گا۔

اور ان کڑے کسیلے ماں باپ اور فرسودہ نظام کے سلیے میں پون ورنہ بچے پر دان چڑ رہے ہیں۔ آنے والی پوداگ رہی ہے اور زندگیاں سانچوں میں ڈھل رہی ہیں۔ نا معلوم منزل تک گھسٹنے کے لئے دنیا میں تلخ اور افلاس کی پال پوس

کرنے کے لئے۔

یہ میری دوسری بھابی ہے۔ میرے بھائی کی انمول دلہن۔ اس کی قسمت کا چمکتا وکتا سورج اس کی مشعل راہ۔ میرا بھائی بڑا ہی تقدیر والا ہے اس نے ایک غریب گھر میں جنم لیا۔ دیوں کی ادھ مری روشنی میں پڑھ پڑھ کر ایک دن جب روشن ستارے کی طرح جلکایا تو ایک بڑی سی مچھلی آئی اور اسے ثابت نکل گئی۔

جوں ہی اس نے اول منبروں سے بی اے پاس کیا نواب گھمن کی نظر التفات اس پر پڑ گئی۔ نہ جانے کدھر کے رشتے تلے جوڑ توڑ کر پروفیسروں کے ذریعے کانٹا مارا اور دیکھتے ہی ایک چھوڑ ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گئے پھر اسے اپنی سب سے قیمتی باندی کی سب سے لاڈلی بیٹی کو بخش دیا۔ بادا بہتیرا بچہ کے مگر ایک طرف تو تھی نواب راوی اور انگلینڈ جانے کا خرچہ اور دوسری طرف کھوسٹ بابا اور ابا و ج ماں اور بن بیاہی بہنوں کی پلٹن کی پلٹن اور ادھ پڑھے بھائیوں کی فوج۔ ظاہر ہے کہ بازی بڑے حلق والی مچھلی کے ہاتھ رہی اور بقیہ جو نکلیں منہ دکھتی رہ گئیں۔ چپٹ منگنی پٹ بیاہ۔ اماں کو سمجھن بننے کا شوق۔ بہنوں کو نیگ اڑانے کی تمنا دل کی دل ہی میں رہ گئی اور پوت پوتنگا بن کر سات سمندر پار اڑ گیا۔ اماں نے جی پر پھڑکھ لیا تھا کہ بلا سے ہڈی نیچی ہے تو جہیز ہی سے افسو کچھ جائیں گے۔ ماشا اللہ اتنے سامان سے پلٹن کے دو چار ساہی تو لیں ہو جائیں گے۔ ودھاکا سلائی سے ہی دو تین بھائیوں کی ناؤ پارا تر جلے گی مگر سارے ارہاں سارے حوصلے پھر سے اڑ گئے جب نواب کی ایک کوٹھی دلہن کا مکان اور دوسری سرال بنی اور بہو ایک کوٹھی سے

دوسری کو بھی کو بیاہ دی گئی۔

انگلنڈ سے لوٹ کر دوٹھا بیاہ کر سسرال چلا گیا اور اماں باوا نے سرے سے دوسرا پودا سینچنے پر جٹ گئے۔ پھر کسی دن اس پودے کے چکنے چکنے پات کیسی باغبان کو نظر آ گئے تو وہ اسے بھی اس گھوٹے سمیٹ کر اپنے "سرماوس" میں لے جا کر رکھ دے گا اور اماں باوا ایڑیاں رگڑتے آخری منزل کو جا کر کپڑے لیں گے۔

اب یہ پہلا پودا اپنے سسر کی ریاست میں کسی مفت خوروں والے عہدے پر فائز ہے۔ علاوہ تنخواہ کے موٹر، گھوڑا گاڑی، کوٹھی، بنگلہ۔ نوکر چاکر اور ایک عدد نواب زادی اسے ملی ہوئی ہے صبح اٹھ کر دربار میں مین سلام جھباڑ چکنے کے بعد وہ دن بھر پڑا کوٹھی میں اینڈ تلے۔ کبھی کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی حیثیت اقرانِ نسل کے لئے استعمال کے جانے والے سانڈ سے زیادہ نہیں جو تھان پر بندھا اگلی ہوئی قے کی جنگالی کئے جارہا ہے۔

اس کی بیوی یعنی نواب زادی کبھی اس کے غلیظ گھر نہ آتی مگر جب بوڑھے باپ نے دنیا کی جنگ سے غائب ہو کر ہتھیار ڈال دیے تو وہ مع اپنے پورے نام جھام کے دو گھڑی کو آئی۔ اس وقت بیچارے نوابی داماد کی شرم کے مارے بُری حالت ہو گئی جیسے گورنر داسرائے کی سواری ابھی ہو تو ایک صاف سی سڑک جن کر جھنڈیاں لگاؤ سی جاتی ہیں تاکہ داسرائے سمجھے کہ سارا ملک ایسا ہی صاف اور جھنڈیوں سے بھا ہوا ہے۔

اس طرح گھر کا سارا کوڑا کرکٹ نظروں سے اوجھل رکھ دیا گیا۔ میت اٹھنے سے پہلے ہی نواب زادی اٹھ کر چل دیں اور

ساتھ ساتھ وہ داماد بھی۔

مگر بڑے حساس دل کا مالک ہے وہ سب کچھ سمجھتا ہے اور اس کے دل پر برف کے گھونٹے ہر دم لگا کرتے ہیں اس لئے وہ جلد از جلد اس ماحول میں سمونے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور خود فراموشی کے لئے شراب پیتا ہے۔ تب وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ سہانے موسم آگئے ہیں اور اس پاس کی ریاستوں کے رنگین مزاج سیر و شکار کو آ جا رہے ہیں اس کی بیوی دوسری نواب زادیوں کی طرح ہرنی بن کر چو کرے یاں بھر رہی ہے۔ وہ خود تین سلام بھاڑ رہا ہے۔ آرام دہ کمرے میں سرو پز سے بے خبر ٹپا ہے۔ اب تو اسے اپنی رفیق زندگی کی آنکھوں میں سے گذرتے ہوئے سوال بھی نہیں جگھا سکتے۔ وہ یہی تو کہتا ہے کہ تمھارا مصروف کیا ہے؟ میرے باپ کی جلد بازی نے تمھیں اس جنت ارصی میں لا دیا ہے اسے غنیمت جانا۔ جو یہ نہ ہوتا تو جو تیاں چناتے پھرتے۔ ایسے موقع پر اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ دنیا کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دے پٹنے اور.....

مگر وہ اس خیال کو اپنے دماغ میں جڑ پکڑنے سے پہلے اکھاڑ پھینکتا ہے دنیا جانتی ہے کہ وہ انگلیں سے کوئی ڈگری یا ڈپلوما تو لانا سکا۔ اس کے جاتے ہی صاحبزادی صاحبہ کو دل کے دورے پڑنے لگے اور انھوں نے رو رو کر اسے واپس بلوایا اس لئے بیچارے کی حالت ایسی نیم چیت رونی جیسی ہے جو قبل از وقت توڑے سے پھسل کر گھٹی میں آن گری ہوا اوپر سے کاہلی اور بے کاری کی پھیپھوند نے اسے اور بھی بے مصرف بنا دیا۔ وہ ایرکنڈیشن کمروں میں سو سو کر

اپنی پرانی کچی کھیریل سے کانپنے لگا ہے۔ فلش کا عادی ہو کر اسے غلیظ کچے
سند اس کے خیال سے بخارج پڑھتا ہے۔ اس کی سمت کا ستارہ بلند یوں پڑھتا
ہے۔ جسے پکڑنے کے لئے وہ آوارہ بگولے کی طرح سرگرداں ہے۔

اور جب وہ بہت تھک جاتا ہے تو غصے میں آکر دھسکی کی مقدار پیگ
میں دو گنی کر کے پرسکون جایاں لینے لگتا ہے۔ یہی اس کی کش مکش ہی اور یہی زندگی
کی جدوجہد۔ نمک کی کان میں جا کر وہ بھی تو نمک کا کھمبا بن چکا ہے۔

جب ان نمک کی کانوں پر بھاڑوں کی چوٹ پڑے گی اور ان کے پر خچے
اڑا کر روٹیوں میں گوندھ ڈالے جائیں گے تو اس خالص نمک کے تودے کی روٹی
نمکین نہیں بلکہ کرکری ہوگی، پھر اس کرکری روٹی کا نوالہ بھی تھوک دیا جائے گا۔
میری ایک بھابی بھی ہے۔ یہ تعلیم یافتہ کہلاتی ہے، اسے ایک کامیاب
بیوی بننے کی مکمل تعلیم ملی ہے۔ وہ ستار بجاسکتی ہے۔ پیٹنگ کر سکتی ہے۔ ٹینس
کھیلنے، موٹر چلانے اور گھوڑے کی سواری میں مشاق ہے۔ بچوں کی پرورش آپا سے
بخیر و خوبی کروا سکتی ہے۔ بیک وقت سوڈیرھ سوہمانوں کی آؤ بھگت کر سکتی
ہے۔ میرا مطلب ہے میرا لوگ کو اپنی نگرانی میں لے کر بڑے لاڈ پیار سے اس کی
کانوینٹ میں تربیت ہوئی اور جب خدا رکھے سن بلوغ کو پہنچی تو اس کے روشن
خیال والدین نے اس کے حضور میں ہونہارا مہواروں کی ایک رجمنٹ کو پیش
ہونے کی اجازت دے دی۔ ان میں آئی۔ سی۔ ایس بھی تھے اور پی۔ سی۔ ایس بھی
تھے۔ حسین اور تعلیم یافتہ بھی تھے، بد صورت اور دودھاری گائیں بھی اشرفیوں
کے تھیلوں کے ساتھ ساتھ منہ کامرہ بدلنے کو کچھ ادیب بھی اور شاعر بھی اور پھر

اس سے کہہ دیا کہ بیٹی تیرے آنکھیں بھی ہیں اور ناک بھی۔ خوب ٹھونک
بجا کر ایک بکرا اچھا نٹا لے۔

سو اس نے خوب جا پٹ پڑتاں کر ایک اپنے ہی پلے کا بھاری بھر کم
چن لیا اور اس پر عاشق ہو گئی جس کی داد اس کے والدین نے عظیم الشان
بہیز کی صورت میں دی۔

لوگ اس منس منسنی کے جوڑے کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں
اور وہ بھی شدت الفت میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کو ڈار بنگت کہتے ہیں
دونوں میاں بیوی ایک ہی فرمے کے بنے ہوئے ہیں۔ ان کے مزاج
یکساں پسند اور ناپسند یکساں، غرض ہر بات یکساں ہے۔ دونوں ایک ہی
کلیپ کے ممبر ہیں دونوں ایک ہی سوسائٹی کے چہیتے فرد۔ ایک ہی پھیلی کے
چپے بنے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے اتنی شدید قسم کی نفرت ہے، وہ ہمینوں ایک
دوسرے کی صورت نہیں دیکھتے۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔

میاں کا ایک دوسرے اعلیٰ افسر کی بیوی سے مشہور و معروف قسم کا عشق چل
رہا ہے اور بیوی اس کے ایک ہم عصر سے مانوس ہے جس کی بیوی اپنی سہیلی کے میاں سے
انگلی ہوئی ہے۔ یہ سہیلی ایک سارجنٹ کے دام الفت میں گرفتار ہے جس کی اپنی بیوی
ایک بو جھل سے سیٹھ کے پاس رہتی ہے۔ جس کی پرانی چچیک دو بیوی منہ پرے
اچھی ہوئی ہے جو انگریزوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے جو ملٹری کے نو عمر
..... اٹھ بھوڑے بھی کیا فائدہ دخل و معقولات سے۔ میرے
بال نانی کے پاس نانی کا استرہ میرے پاس۔ میرا استرہ گھیارے

کے پاس۔ اس طرح یہ زنجیر ایک حلقہ کے منہ میں دوسرے کی دُم لئے دنیا کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ میری بھابی بھی اس زنجیر کا ایک حلقہ ہے اور وہاں جب تک لٹکی رہے گی جب تک زنجیر کرہ ارض کو جکڑے رہے گی۔

اور میری تیسری بھابی تو جگ کی دلہن ہے۔ وہ اُس شرک کے مانند ہے جس پر سب چلتے ہیں۔ اس چھاؤں کی طرح ہے جو ہر تھکے ماندے کو اپنی آغوش میں ہٹیکیاں دے کر خود فراموشی کے اسباب مہیا کرتی ہے۔ وہ ساجھے کی لاندی ہے جو آخر میں چوراہے پر پھوٹے گی، وہ جنہیں منہ کا فرا بد لنے کے لئے نعمت خانہ میں مال مصالحہ رکھنے کی توفیق نہیں وہ اس صلائے عام سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ روز شام کو نئے دو لھالی دلہن بنتی ہے اور صبح کو بویا ہو جاتی ہے وہ اپنی ان بہنوں سے خوش نصیب ہے جو اس کی دین سے ایک شب میں دس بارہ بار دلہن بنتی ہیں۔ دس برائیں چڑھتی ہیں اور دس بار راندھوتی ہیں۔ بعض لوگ ناک چڑھی پڑوسنوں کی طرح اس پر ٹیڑھی ٹیڑھی نظریں ڈالتے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ کچھ نیچے ہے۔ کوئی گناہ کر رہی ہے۔

مگر خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون سا پاپ کر رہی ہے۔ دنیا میں کیا نہیں بکتا اور کیا نہیں حزیدا جاتا۔ جو لوگ اسے جسم بیچتا دیکھ کر اتنا بلبلا اٹھتے ہیں کیا لوگ پیسے کے عوض اپنے دامغ نہیں بیچتے اپنے تخیلات کا سودا نہیں کرتے۔ اپنا ضمیر نہیں بیچتے۔ معصوموں کا خون بھی تو اُنے میں گندھ کر بکتا ہے۔ کاری گری کا

گاڑھا پسینہ بھی تو کپڑے کے تھان رنگ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ ایک کلرک کی پوری زندگی چالیں روپیہ نہیں پر بک جاتی ہے۔ ایک بیچر کی پوری عمر کا سودا اتنے ہی داموں پر ہو جاتا ہے، تو پھر اس جسم خاکی کے لئے کیوں اتنے دے۔
 اور اس کا باپ کالے بازار کا مغز ستون تھا۔ اس کا بھائی 'ناجا' زور راج سے 'ناجا' لوگوں تک پہنچاتا تھا، اس کا دوسرا بھائی پولیس کا ذمہ دار فروہوتے ہوئے بھی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کیا کرتا تھا۔ اور دنیا ان سب کو جانتے ہوئے بھی انہیں گلے سے لگا کر بچھڑی ہے۔ وہ بھی تو آخر انہیں میں سے ایک ہے جہاں آدے کا آدا ٹیرھا ہے وہاں اس کی بھی کھپت ہونی چاہیے۔

ویسے وہ کوئی پشہما پشت کی زندگی نہیں اس میں اس کا کیا قصور، وہ آرٹ کی خدمت کرنے فلم لائن میں گئی اور وہاں سے لوگ نہ جانے کب اور کیسے اسے دھیرے دھیرے اس کو نے میں کھینچ لئے۔ اس نے ہی تو کیا کہ فلم اسٹار بننے کی خاطر ہر آتلے پر سر کٹا یا۔ فنانسر سے لے کر ایکسٹریٹک کے گھر کی خاک بھانتے بھانتے وہ خود پھلپنی بن گئی۔ اس گڑبڑ میں وہ نہ جانے کون سا رہبر سل غلط کر گئی جو بجائے آسمان فلم کا درخشاں تارہ بننے کے وہ یہاں سڑک کے کنارے مٹھانے لگی۔

یہی نہیں کہ اس نے شادی نہ کی ہو، اس نے اس کو چے کی دشت پیائی کر کے دیکھ لی، مگر شادی کے چند ہی مہینے بعد اس کا میاں، حب معمول ادھر ادھر جانے لگا۔ وہ شاید تنگی ترشی میں بھی گزر کر لیتی، مگر وہ تو جتنے پیر سکڑتی گئی اتنی ہی وہ چادر کترنا گیا۔

سوائے بیوی بننے کے اُسے اور کوئی ہنسنے آتا تھا، وہ چاہتی تھیں
پنتیس کی اتانی گیری کر سکتی مگر اتنے روپے سے تو اسے تپسو کا خرچ چلانے کی
بھی عادت نہ تھی، یا ہسپتال میں نرس بننے کی کوشش کرتی، اور ساٹھ روپے
کے عوض، خون، پیپ، کھانسی، بخار، تھوہرے دست میں قلابازیاں کھاتی، لیکن
وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس قسم کی حماقتوں میں جان کھپانے کا شوق اس کے خمیر
میں حلول نہیں مجبوراً اسے فلم کے دروازے پر دستک دینی پڑی۔

رنگین فلم ہندوستان میں بنتے تو شاید اس کا میدان شہاب رنگ کچھ برق
پاشیاں کر سکتا، لیکن ان کلمے سفید فلموں میں اس کی چوڑی چھلی ناک اور چنبر
آنکھوں نے اسکی لیٹا ڈبوی۔ دو چار تھکی ہاری فلمیں بنا کر وہ فنانس کی آغوش
سے گر کر ڈائریکٹر کے پاس آئی۔ وہاں سے پہلی تو میر و اور سائڈ ہیر و کے سہتے
جرطی۔ اس کے بعد ایک کیمرو مین لپکا۔ وہاں سے جو ٹپکی تو
فرگن نامی میں بھسک گئی اور جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اس بازار حسن میں معلق
پایا مگر وہ اب بڑی سمجھدار ہو گئی ہے۔ اپنے گاہکوں کو بڑی ہوشیاری سے ناپتی تھتی
اگر کسی دن کوئی موٹی مرغی، بد صورت، بیوی اور غلیظ بچوں کی مہکالی ہاتھ آگئی تو وہ اُسے
اپنا مستقل گاہک بنا ڈالے گی اور سرکار سے اس استقلال کا سارٹیفکیٹ حاصل کر کے
کالے بازار کے آئندہ ستون تعمیر کرنا شروع کر دے گی۔

یہ ہیں آدم و حوا کے جانشین، تخلیق کے علم بردار اور دنیا کی گاڑی کو
چلانے والے جو بجائے چلانے کے اسے لات گھومنے سے آگے سمجھے ڈھکیل رہے
ہیں۔

مگر ٹھہریے میری ایک اور بھابی ہے، پر وہ نہ جانے کہاں ہے۔ میں نے ایک آدھ بار صرف اس کی جھلک دیکھی ہے۔ کبھی اس کے ماتھے پر ڈھلکے ہوئے زرتا آجیل کو دیکھا ہے۔ مگر اسے پرچم بننے نہیں دیکھا۔ ان کی دو وہ ایسی پیشانی پر محنت کی افشاں چنی دیکھی ہے۔ مگر اس افشاں میں اوڑے پیلے نیلے سب رنگ ہیں اور سہاگ کی سرخی کی جھلک نظر نہیں آتی۔ میں نے اس کی حسین انگلیاں تو دیکھی ہیں، مگر انھیں اچھے بالوں کا پتچ و خم سلجھاتے نہیں دیکھا۔ اس کی سانوئی شام کو شرمیلے والی زلفوں کی گھٹائیں دیکھی ہیں مگر انھیں کسی کے تھکے ہوئے شانو پر پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ میں نے اس کا چکنا میدے کی لونی جیسا پیٹ تو دیکھا ہے۔ مگر اس میں ابھی نئی امید کے پودے کو پروان چڑھتے نہیں دیکھا میں نے اس کی چٹوئیں دیکھی ہیں مگر انھیں شمشیر بننے نہیں دیکھا۔

سننے میں سنہرے دلیوں میں وہ آن بسی ہے اور ملکتے کی افشاں امر سہاگ کا سیندور بن چکی ہے..... اس کی مہکتی زلفیں چوڑے چکے شانوں پر بکھر رہی ہیں..... اس کی پتلی پتلی انگلیاں اچھے بال ہی نہیں سلجھا رہی ہیں بلکہ بند و قوت میں کمار توں بکھر رہی ہیں اور تلواروں کی دھار پر اپنی تیکھی چٹوئوں سے سان رکھ رہی ہیں۔

دور جانے کی ضرورت نہیں..... یہیں بہت قریب میرے پڑوس میں تلنگانہ کی البیلیاں، جی دار جوانوں کی آرتیاں اتار رہی ہیں۔ اور ان کے ہتھیاروں پر عقیدت کے پھول چڑھا کر سیندور کے ٹپکے لگا رہی ہیں میرا رادو ہے کہ ایک دن میں بھی اس سرزمین پر جاؤں گی اور اُن

سہاگنوں کے ماتھے کا پھوڑا سا سینہ دور مانگس لاؤں گی اور اسے
اپنی مانگ میں رچاؤں گی ۔

اور پھر وہ میری پھیتی بھابی میرے دیس کے کونے کونے میں اُن
بیسے گی ۔ اگر ان سانس مندوں کے دُرسے میری بھابی بن کر نہ آسکی تو میں دعوے
سے کہتی ہوں کہ وہ میری بہو بن کر تو ضرور آسے گی ۔

بمبئی سے بھوپال تک

”بھئی واہ خوب گئے تم لوگ بھوپال! یوسف نے
مسترت سے بلبلدا کر کہا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کون ذات شریف ہیں۔ یوسف صاحب
اور بھوپال میں منعقد ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس سے ان کا کیا
رشتہ؟

اگر آپ کو کسی ایسے آلے کی تلاش ہو جس کی مدد سے بغیر دماغ کھپائے
یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی چیز ترقی پسند ہے اور کون سی رجعت پسند تو آپ
یوسف سے رجوع کیجئے۔ جس بات پر یوسف گالیاں دے اور کانٹے دوڑے
سمجھ لیجئے وہ سوفیستی ترقی پسند ہے اور جس پر وہ دانت نکال کر منہسنے لگے
وہ رجعت پسند ہے۔

اب اس ہی کی بات سے اندازہ لگا لیجئے کہ یوسف کے خیال میں
 عسکری دنیا کا سب سے بڑا فلاسفر ہے۔ میرا جی عظیم ترین شاعر ہے، اور
 عباس نے اگر کوئی سلیقہ کی چیز ساری عمر لکھی ہے تو وہ "اور انسان مر گیا"
 کا دیباچہ ہے۔ صحیح طریقہ جینے کا وہی ہے جس کی تصویر راما مندا سا کرنے
 کھینچی ہے۔

تو پھر علی سردار جعفری کی گرفتاری کی خبر سن کر جو ہماری صفوں میں
 بھگدڑ پڑ گئی، اسے دیکھ کر یوسف کی باچھیں کیوں نہ کھل جائیں؟ کوئی دوسرا
 وقت ہوتا تو میں شاید چڑھ جانے کی کوشش کرتی مگر سیما کے پاجامے نہیں
 ملے تھے، جانگیوں میں سردی لگتی چلو اچھا ہی ہوا جو کچھ ہوا۔

جعفری نے بڑا گھر بسایا۔ کیفی اعظمی اور نیاز حیدر کے نام وارنٹ
 بھوپال کے مشاعرے کا تو مرثیہ لکھ گیا۔ جعفری ہی ہم لوگوں کو بھلی ڈرا دھمکا کر
 بہلا پھسلا کر بھوپال لے جا رہے تھے، ادھر سے ڈھیل ملی، ادھر ہم سب کے
 سب کٹ پتلیوں کی طرح چت پڑ گئے۔

اتوار کے دن یہ فیصلہ کر کے کہ بھوپال تو جانا نہیں ہے چلو ترقی پسند
 مصنفین کی میٹنگ میں سردار کی گرفتاری پر ذرا اظہارِ غم و غصہ ہی کر آئیں۔
 اور جناب وہاں جا کر صورت حال بدلی ہوئی نظر آئی۔ جعفری کی غیر موجودگی
 میں کرشن چندر سالار اعلیٰ بنے مورچہ سمجھالے کھڑے تھے۔

"ہمیں بھوپال جانا ہے اور اب تو ضروری جانا پڑے گا" سالار
 اعلیٰ نے الٹی میٹم دے دیا۔ اور تو شاید لطیف جو عرصہ ہوا ادب کا دامن

چھوڑ کر فلم سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ جوش میں آگئے اور کہا ہماری انتہائی
 بزدلی ہے کہ اگر ہمارا ایک ممبر پکڑا جائے تو ہم سب کے سب دبا کر رہ
 جائیں۔ ایک سردار کی گرفتاری نے ہم سب کی گردنوں میں کم ہمتی کا طوق
 ڈال دیا۔ بس جناب آگیا جوش اور میں نے راتوں رات سیما کے پاچے
 سی ڈولے اور یہ مختصر سا لشکر چھ بڑے اور دو چھوٹے افراد پر مشتمل بھوپال
 روانہ ہو گیا۔ کرشن چندر، ہندو نامتھ، شاہد لطیف، مجروح، عادل رشید
 اور میں ایک بچی میری اور ایک عادل رشید کی۔ باقی کی رونق صندوقوں
 ناشتہ دانوں اور بستروں نے ہٹا کر دی۔

ارادہ تو یہ تھا کہ تھروڈ میں جائیں گے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ تھروڈ کا
 وٹہ ربر کا بنا ہوا نہیں، رہاں تو ہوا کی بھی مجال نہیں کہ پر مار سکے۔ ویسے تھروڈ
 کلاس کی تمام مشکلات ریلوے کے محکمے نے بڑی کاوشوں کے بعد سکند کلاس
 ہی میں ہیٹا فرمادی ہیں لہذا ہم لوگ بڑے آرام سے بستروں، پوٹلیوں اور
 صندوقوں کے نوک وار کونوں پر بیٹھ کر رمی کھیلنے لگے۔

اتنے میں عادل رشید نے چند پہاڑیوں کی طرف نہ جانے کون سی
 پہاڑی کو پھانٹ کر اشارہ کیا "حاجی منگ شریف" حاجی منگ شریف،
 اور ہم سب اپنے چہروں پر تقدس کی گھٹائیں جمع کر کے پہاڑیوں کو گھونے
 لگے۔ اس وقت فجر کے پاس دو جو کر آئے تھے اور وہ مقرر تھے کہ قبر پرستی
 کا خیال چھوڑ کر سب کو تاشوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، مگر ہم نہایت
 دل لگا کر دعا مانگا ہے تھے "یا حاجی منگ شریف! جو کر دلو ایسے۔ یا

پر دستگیر! جو کر دلو ایسے۔“

”آپ لوگوں کو اعتقاد نہیں ہے اس لئے آپ کی دعا ہرگز قبول نہ ہوگی۔“ مجروح نے موقع پاتے ہی جو کر پار کر دیا۔

اور میں سوچنے لگی۔ یہ اعتقاد کیا بلا ہے۔ ہم لوگوں کو ہر چیز پر اعتقاد رکھنے اور رکھوانے کی عادت کیوں ہے؟ کب تک مردوں سے اپنے حقوق مانگتے رہیں گے۔ مجروح کی طرح تاش کی گڑھی میں سے جو کر کیوں نہیں سرکالیتے۔
”ٹھٹھ میں ان لوگوں کے“ عاؤل نے جگہ کی قلت کی وجہ سے جسم توڑ مڑ کر مختصر بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ”قبر میں پر پھیلا کر سونے کی جگہ تو ملتی ہے۔“

”ان کے ہاں پگڑی و گڑھی تو نہ بھرنی پڑتی ہوگی“ مہندرنا تھہ بولے۔
”مگر حسین کہاں ہے ان بیچاروں کے نصیب میں۔ دن رات کی دھما جو کر گڑھی تو مچی رہتی ہے۔ کبھی بھوت اتر رہے ہیں، کبھی بے سری تو الیاں ہو رہی ہیں۔ اور تو اور لوگ اپنی منہ چڑھی رنڈیوں کو لے کر داد عیش دینے بھی یہیں آتے ہیں۔ انسان مرتا ہے۔ زندگی کی دوڑ و طوب سے تھکا کر پر پیرنے کے لئے، نہ کہ یوں اپنے سینے پر کو دلو دلوانے کے لئے۔“

”کبھی میں نے کبھی خطبہ صدارت نہیں کھاہے اور نہ ہی اب لکھ سکے گا ارادہ ہے۔“ میں نے الٹی میٹم دے دیا۔

”ارے بالکل مشکل نہیں۔ گھنٹہ بھر میں لکھ جائے گا“ سالار اعلیٰ نے اطمینان دلایا۔

”مگر مجھے معلوم ہی نہیں کہ وہ کم بخت لکھا کیسے جاتا ہے۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ شروع کہاں سے کروں..... معزز حاضرین.....“

حاضرات.....“

”نہیں جی ان حماقتوں کی قطعی ضرورت نہیں“ اس کے بعد انھوں نے تمام متھکنڈے خطبہ صدارت لکھنے کے باقاعدہ سمجھانا شروع کر دیے جو میری کھوپڑی کیسے کسی سوار خ سے بھی لکھنے پر رضا مند نہ ہوئے اور مجھ پر ہول سوار ہونا شروع ہو گیا۔

”میں خطبہ صدارت ساری غم نہ لکھ سکوں گی۔ بہتر ہے کہ آپ لوگ ایک ایک پیرا گراف بانٹ کر نہایت خوشحظ لکھ ڈالیں، میں اُسے پڑھ دوں گی جیسا کہ میں نے ایک دفعہ اور بھی کیا تھا۔“

یہ جب کا واقعہ ہے جب میں نے پہلی دفعہ اسکول میں کام کرنا شروع کیا تھا ہمارے مینیجر صاحب نے حکم دیا۔

”ایک خطبہ صدارت لکھ ڈالیے“

”معاف کیجئے گا مجھے خطبہ صدارت لکھنا نہیں آتے۔“

”ارے اس میں بات ہی کیا ہے۔ گھنٹہ بھر میں لکھ جائے گا۔“ انھوں نے کرشن چندر کی طرح چٹکی بجا دی تھی۔

”آپ ایک گھنٹہ کہتے ہیں ایک برس میں بھی اتنی ثقیل چیز نہ لکھ سکوں گی۔“

”ہیں! یعنی خطبہ صدارت ثقیل چیز ہوتا ہے۔“

”جی ہاں۔ اور قطعی بے ہودہ بھی۔“

”معاف کیجئے گا اور آپ جو یہ بیہودہ، معاف کیجئے گا افسوسناک

حد تک بیہودہ چیزیں لکھا کرتی ہیں.....“ جل گئے

”مگر آپ خطبہ صدارت تو افسوس ناک حد تک بیہودہ شاید لکھوانا

پسند نہ کریں گے۔“

”خیر صاحب میں ہی جھک ماروں گا۔“

وہ خون کھولتے رہے اور دوسروں بیچارے نہایت دقیق

مستم کی جھک مار لائے۔ مگر یہاں کوئی مینجر صاحب کی طرح جھک مارنے کو تیار نہ ہوا۔

”آپ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دلوانا چاہتی ہیں؟“ کرشن نے

طعنہ مارا۔

”کون احمق مردوں سے برابری کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے حقوق اور

ہماری قوم واریاں زیادہ ہیں اور زیادہ رہیں گی۔“

مگر کوئی طعنہ کوئی خوشامد اور کوئی دھمکی کا راکہ ثابت نہ ہوئی۔ کرشن

چند رصوف چند پوائنٹس سے آگے نہ کہہ سکے۔

”ارے حاجی ملنگ، حاجی ملنگ!“ عادل رشید پھر چلائے

”ارے بھئی یہ حاجی ملنگ ہمارے پیچھے کیوں پرگئے ہیں؟“ کرشن

بولے۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے ہمارے ساتھ کانفرنس میں بھوپال جا رہے

ہیں۔ اور کرشن چندر نے تحنیل کی لگام چھٹاک کر چھوڑ دی.....“ ان

پیر۔ فقیر لوگوں کی کیا کافر نہیں ہوتی۔ اگر ان کی ایک کافر نہ ہو اس میں کلیر شریف، اجمیر شریف، غازی میاں، معین الدین چشتی، شریف لائیں تو جھلا کس قسم کی بات چیت کریں گے۔ ان کی کیا مشکلات ہوں گی۔

یہی کہ لوگ بڑے بہبودہ ہوتے جا رہے ہیں۔ نذر نیاز غائب خالی خالی دعائیں مانگنے چلے آ رہے ہیں۔ اوھر بوہروں اور خوجوں کی آمد میں بھی کمی آگئی ہے۔ بڑے بڑے آسامی تو پاکستان کھسک گئے ہیں۔ اب ٹٹ پونجیے رہ گئے ہیں، سو یہ کس کام کے۔ باقی رہے دہریے، سوان کاشتر کافروں کے ساتھ ہو گا۔

”اُٹھ تو پھر یہ لوگ بھی پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ دنیا کی فتنیں مرادیں پوری کرتے ہیں۔ ذرا اپنا مزار شریف کھسکالے جائیں۔“

”کھسکانا ہی پڑے گا ایک دن بے چاروں کو۔ اپنے باپ کی کتتی ڈھیر ساری یا تراشیں بن رہی ہیں۔ نئی یا تراشوں کے سامنے یہ بیچاری پرانی قبروں کی کیا چلے گی۔“

”یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں۔ ہندستان ایک ریکولر اسٹیٹ ہے۔ یہاں مذہبی رواداری قائم رہے گی۔ مسلمانوں کو حق حاصل ہو گا کہ وہ جتنے حاجی منگ بنانا چاہیں آزادی سے بنا سکتے ہیں۔“

”ارے کفر کیوں باب ہے ہو کم بختو! حاجی منگ کو غصہ آگیا تو ریل اٹھا کر شیخ دیں گے“ عادل رشید نے ڈرایا

”سبوٹاج — بڑا رکیک حربہ ہے“ شاہ صاحب بولے۔

”اتنا ہی رکیا جتنا صفت مخالف کے افراد کو جلیوں میں بٹھولنا ہے، ان کی زبانوں پر تالے ڈالنا ہے، ان کے اخباروں کا گلا گھونٹنا ہے۔“ کرشن نے تشریح کی۔

۱ ”شش شش پتا چلو پتا“ مہندرنا حق بولے۔

اور ہم لوگ پتہ چلنے لگے۔

ساتھ کھانا بھی تھا اور بھوک بھی، مگر ٹفن کیر پھول کر کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس مہم کو سرانجام دینے کے لئے خاص قسم کی مٹ بائی کی ضرورت ہے۔ نوالہ واقعی منہ کے بجائے ناک میں گھس رہا تھا۔ کچھ تو ڈاننگ کار کی لہریں اور کچھ ریل بھی ہل رہی تھی۔ اُدھر کوئی بکس کا کونہ چھ رہا تھا اور کسی ہولڈال کا بکسوا ان کے آ رہا ہو رہا تھا۔

”ارے صاحب انقلاب لانا مذاق نہ باشد۔ سارے یہ صندوق اور ہولڈال کس شمار و قطار میں ہیں۔ آج مجروح انقلاب لانے کا بکا فیصلہ کر چکے تھے۔ چنانچہ جب کوئی بھاری صندوق گھیٹنے کا موقع آتا شاید لطیف لکھارتے۔“

”میاں مجروح! اسی برتے پر کہتے ہو انقلاب لانا ہے۔“ اور جوش میں آکر مجروح بکس گھیٹتے اور بستر گھیٹتے۔ بچیوں کو باہر روم لے جاتے ایسے کہ ان کے جوتے نہ خراب ہوں اور پھر بکس گھیٹتے۔ اور اس شان سے کہ ہر بار کمپارٹمنٹ میں انقلاب عظیم کا لطف آ جاتا۔

کھانے کے بعد سونے کا اہم سوال اٹھا۔ کرشن چندر اور شاہد لطیف نے

انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور ہم لوگ شہر نارنجیوں کی سی مسکین صورت بنا کر
 بیٹھ گئے۔ ایک سیٹ مجھے اور سیڈیا کو دی گئی۔ ایک سیٹ عادل رشید اور ان
 کی لڑکی ناہید کو۔ ہم سچے والوں کا تو انتظام ہو گیا۔ رہ گئی ایک چھوٹی سی سیٹ
 اور باقی چار آدمی۔ حقوڑی سی تو تو میں میں کے بعد یہ طے پایا کہ وہ سیٹ
 کرشن چندر اور ہندو رناٹھ کو دے دی جائے۔ یقین مانئے دو اچھے بھلے مرد
 نہ جانے کس طرح اپنے آپ کو توڑ مڑ کر اس سیٹ پر اٹک گئے۔ رہ گئے شاہد
 اور مجروح۔ تو ان کی حالت یہ تھی کہ اگر سوئی کی نوک پر بھی لٹکا دئے جاتے
 تب بھی نہایت آرام سے سو جاتے۔ دو چار گھڑیوں، پوٹلیوں اور بڑی
 ساخت کے صند و قوں پر یہ لوگ بیٹھے، پھیلے، پھر خزانے لینے لگے۔

بھسا دل کے اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ وہاں کے ترقی پسند مصنفین کو
 نہ جانے کس طرح خبر مل گئی کہ آج بھوپال جانے والے ادھر سے گزریں گے
 وہ لوگ ہار پھول لئے اتنی سردی میں بے تکی رفتار سے آنے والی گاڑی کا
 انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں ایک ہی پیغام دیا کہ بھوپال میں منعقد
 ہونے والی کانفرنس میں میدان ترقی پسند مصنفین کے ہاتھ سے نکل کر کہیں
 رجعت پسندوں کے قبضے میں نہ چلا جائے۔ یہ سن کر اذگتی ہوئی فضا
 چوکنی ہو گئی اور ہم لوگ اپنے گلوں میں ان کے ہار اور دلوں میں ان کا قصد
 لے کر روانہ ہو گئے۔ کسی ایک محاذ پر ہمیں شکست ہو گئی تو باقی کے کتنے محاذ
 کمزور پڑ جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو گا۔

پلک بھپکتے رات گزر گئی۔ پو پھٹتے ہی مجروح نے حلق پھاڑ کر پکارنا

م شروع کیا کہ چلے آگئی ہے۔ اگر فوراً نہ پی گئی تو ٹھنڈی ہو جائے گی۔
 بسکٹ بھی کھانے پر ہیں گے ورنہ پیسے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ خیر
 صاحب چلے بھی اپنی پڑھی اور پچھچا سا بسکٹ بھی کھانا پڑا۔

مجرع ایک تو ترقی پسند شاعروں کے نمائندہ بن کر جا رہے تھے
 کیونکہ اللہ کے دیے ایک وہی باقی بچ رہے تھے۔ دوسرے دولہا بن کر بھی
 جا رہے تھے کیونکہ بھوپال سے انھیں سیدھے اپنی برات میں شرکت کرنے
 کے لئے جانا تھا۔ لیکن وہ نہایت کھڑے پن سے جھینپ رہے تھے۔ جیسے اگر وہ
 دولہا بن گئے تو انقلاب نہ لاسکیں گے۔ شادی بذات خود ایک رحمت پسند
 فعل ہے۔ خاص طور پر ایسی حالت میں کہ فریق مخالف گاؤں کی ایک ناخواندہ
 الٹھڑ وٹھن ہو جیسی کہ مجروح کے پلے باندھی جا رہی تھی۔

”ارے بھئی تو کیا زبردستی ہے۔ کیوں کر رہے ہو تم ایسی شادی؟“
 ہندرناتھ بھلائے۔

”اس لئے کہ میں نہیں چاہتا کہ میری گرمستی زندگی چکنی ہموار شرک پر
 تیل دیے ہوئے پیپے کی طرح پھسلتی چلی جائے۔ مجھے ہچکولوں کی ضرورت ہے
 میں خانہ آباد ہو کر بیوی بچوں کی محبت میں اونگھ جاؤں گا، پھر یہ کساک، یہ
 ٹھیس اور یہ گداز منزل ہو جائے گا۔“

اور میں سوچنے لگی یہ کیا بات ہے۔ یہ ادیب اور شاعر گاؤں کی
 بھولی بھالی الٹھڑ وٹھن کو صرف تخیل کی دنیا میں اچھالتے ہیں اور جو زندگی
 میں آنا سامنا ہو جائے تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ کیوں؟ —

ان مردوں کو اپنے سارے کارناموں کا الزام عورت کے سر ہوتے ہیں
 میں کیا مزہ آتا ہے۔ جب تک کیلجے پر بے وفائی کا زخم نہ لگے شاعری کی مدد سے
 نہیں پھپکتی۔ الہام صادر ہونے کے لئے لازم ہے کہ کوئی چک پھیریاں دیکر
 چھوڑ دے..... مگر اپنے مجاز کو تو یہ نسخہ الٹا پڑ گیا۔ شاید خوراک
 اندلیتے وقت ہاتھ بہا گیا اور مقدار کچھ زیادہ ہو گئی۔ اب حکیموں نے یہ
 رائے قائم کی ہے کہ کوئی نہایت لطیف سی معجون اللہ شافی کہہ کر دی جائے
 تو یقیناً شاعری کی مرہباتی ہوئی کو پیل میں جان پڑ جائے گی۔ اور میں نے
 دعائیں لگی کہ خدا کرے یہ گاؤں کی نئی نویلی وطن جلد ہی داؤں پیچ سیکھ
 جائے اور مجروح کے دل کو دو چار ایسے اڑنگے لگائے کہ ایک بار واقعی غم
 جاناں پھیل کر غم دوراں ہو جائے۔

بھوپال کے اسٹیشن پر لوگ استقبال کو موجود تھے۔ میں اور شاہد
 جان نثار اختر کے یہاں پہنچا دیے گئے۔ عادل رشید اپنی سسرال چلے
 گئے اور کرشن چندر اور مہندر وغیرہ کو اختر سعید لے گئے۔ اس چھوٹے سے
 سفر کے بعد ہی یہ بٹوار اچھ شاق گذرا۔

جاں نثار اختر کے گھر پہنچے تو زمینہ ہی پر میں اور صفیہ ایسے
 بھڑے پن سے گلے ملے کہ نیچے ٹڑکتے ٹڑکتے بچے۔ اوپر پہنچ کر ایک دوسرے
 کے بچوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ صفیہ نے کہا میری بچی ہم دونوں سے
 اچھی ہے۔ اور میں نے کہا اُس کے بچے ان دونوں سے اچھے ہیں اور
 پھر ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ایک بہتر دنیا کی بنیادیں ڈال رہے ہیں

ایک تندرست اور خوبصورت دنیا -

ناشتہ کر کے صفینہ تو کسی کام سے کالج چلی گئی اور محمد سے کہہ گئی کہ جو کچھ جی چاہے پکواؤ اور کھاؤ اور مجھے خیال آیا کہ مجھے ابھی جھک مارنا ہے یعنی خطبہ صدارت — اُن میری جان نکل گئی۔ میری ہی سچی کیا کم ہتی کہ اور صفینہ میری تربیت پر اپنے دونوں چراغ روشن کر گئی۔

شکر ہے خطبہ صدارت فسادات کے بارے میں تھا۔ ان تین پونے ل کر میری ہستی کو کھنڈ بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کرشن چندر کا کہنا ہے کہ میں نے اس میں تلخ نوائی سے کام لیا ہے۔ ضرور لیا ہو گا اور بخدا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اُن یہ بچے!

کانفرنس کے پہلے اجلاس میں جاتے وقت میری اور صفینہ کی کسی نہایت ہی معمولی بات پر کھٹ پٹ ہو گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ میرے خمیر میں تیزابیت بہت ہے اور میں کہتی تھی کہ اُسے بناتے وقت فرشتوں نے مہی کو بجائے سادہ پاٹی کے شہد اور دودھ میں گوندھ ڈالا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو احمق سمجھتے ہوئے منٹو ہل پونچ گئے۔ ہال کے ایک کونے میں پردے کا انتظام تھا۔ مردانے میں بھیڑ کم تھی، مگر زنا خانے میں کافی گھما گھٹی تھی ہال بڑا تھا اور مائیکروفون کچھ عجیب ڈھپٹ قسم کا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور لڑکیاں رد ہال سنسی ہو کر اس کونے سے اُس کونے تک اس امید میں دوڑ رہی تھیں کہ شاید ایک آدھ لفظ لیک سکیں۔ جب ناامید ہو گئیں تو خالص غورتوں کے انداز میں بیٹھ کر ترقی پسند مصنفین کی ناکوں اور مونچھوں پر ناقدانہ

بحث مباحثہ کرنے لگیں لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ ایک دم سے مائیکروفون جاگ اٹھا۔ جوں ہی کرشن چندر نے خطبہ صدارت شروع کیا۔ ان کی آواز صاف آنے لگی۔ اس پر میں نے اور صفیہ نے ایک بواگس قسم کا لطیفہ ایک دوسرے کے کان میں پھونکا۔

خطبہ صدارت پسند کیا گیا۔ نہ صرف اپنے موضوع کی بنا پر بلکہ کرشن کی اس شاعری کے بل بوتے پر جس پر ایک دفعہ علی سردار جعفری کو بھی اعتراض ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کرشن کا طرزِ تحریر نوخیز دلوں کو بڑا مسحور بنا دیتا ہے کرشن جو تا بھی مارتا ہے تو شاعری میں پیٹ کر اور یہی وجہ ہے کہ ضرب گہری پڑتی ہے مگر نشان نہیں پڑتا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں تو جیسے کھڑ وچے سے مارتی ہوں جن سے کھال چھل جاتی ہے۔ خطبہ صدارت کا بھوت دانت نکوس کر مجھے ڈرانے لگا ہے۔ واپس آکر میں نے اس میں کے کسی ایک کلمے ذرا کھٹل کئے۔

کتنے دماغوں پر کرشن کو گرفت حاصل ہے۔ کچی ٹہنیاں اس کی تحریروں کی آندھیوں کے رخ پر جھک رہی ہیں۔ کتنے معصوم دلوں میں تفکر کا بیج پڑ رہا ہے۔ نئے ایوانوں کی بنا ڈالی جا رہی ہے۔ اگر معمار کا ہاتھ لغزش کھا جائے تو.....؟ قلم بھی تو رہنمائی کرتا ہے۔ کبھی کبھی بھٹکا بھی دیتا ہے یہ کوئی معمولی ذمہ داری نہیں۔

دوسرے دن شاہد لطیف نے جلسہ کی صدارت کی۔ ظفر صاحب نے اپنا ایک ڈرامہ پڑھا، لیکن مائیکروفون کا دماغ آج پھر ساتویں آسمان پر تھا

دوسرے ڈرامہ ذرا طویل تھا، تیسرے موصوف نے اُسے مقررہ وقت میں ختم کرنے کی غرض سے بے حد سرپٹ پڑھا۔ میں نے بھی کہانی پڑھی صرف ٹرایل کے خیال سے کہ کہیں خطبہ صدارت پڑھتے وقت ٹانگیں لرز کر گھٹکی نہ بندھ جائے مگر اس قسم کا کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ نہ ہی گھٹکی بندھی نہ ہی ٹانگیں لرزیں۔ کتنے ہی حاجی لٹاک شریف ہم نے اپنی پیٹھ پر سوار کر رکھے ہیں۔ انہیں کب پیٹھ چکیں گے۔ ابھی کتنے مرحلوں سے ہمیں اور گزر رہا ہے۔ میں جو بڑی آزاد اور ترقی پسند بنی ہوں، ان واہموں کے چنگل میں پھنسی بیٹھی ہوں تو پھر وہ جو پردے کے پیچھے دبکی بیٹھی ہیں، ان سے کیا کر سکتی ہوں۔

سند لال جی کی صدارت میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا اجلاس بڑا شاندار اور رعب و اب کار ہوا۔ انہیں مائیکروفون کی تو ضرورت نہ تھی۔ ہال کا کونہ کونہ ان کی خطیبانہ لہکار سے گونج رہا تھا۔ مجھے تو بس اس بات پر رشک آ رہا تھا کہ وہ خطبہ صدارت لکھنے کے بجائے بول رہے تھے۔ موضوع ”دو زبان کی حمایت“ تھا۔ لیکن وہ تو چوٹھی رسید کر رہے تھے۔ کبھی دو ہاتھ سیاست کے، کبھی اقتصادیات کے، کبھی ایک آدھ جھانپڑ مذہب کے بھی رسید کر دیتے تھے۔ پھر ہندو مسلمان دونوں کو بھگو بھگو کر رسید کیں۔ بیچ بیچ میں حرب موقع ایک آدھ دشمنیاں کے بھی چپکے چپکے جاتے تھے۔ پھر جبل خانوں اور ان کے مالکوں کی ٹانگ گھسیٹ ڈالی۔ دو چار پٹنیاں اکھنڈ ہندی اور اردو کو بھی دے ڈالیں۔ سوائے کھانے پکانے اور سینے پر دھونے کے نسخوں کے دنیا کے ہر پہلو کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کی تقریر سن کر یہ تو یقین ہو گیا کہ

سند رلال جی مختلف زبانوں میں مختلف باتوں پر ایک ہی وقت میں ایک ہی
روانی کے ساتھ تقریر کرنے کی حیرت انگیز مہارت رکھتے ہیں۔ مٹھاس اور کڑواہٹ
نکبینی اور ترشی نہایت ہی موزوں اور نپنی ٹلی مقدار میں شامل کرتے جاتے
ہیں۔ کہیں تو مرین کو پچھار کر نسخہ میں اتارتے ہیں تو کہیں چپکے سے شکر میں
لپیٹ کر کوئین کی گولی کھلا دیتے ہیں۔ مگر پورا نسخہ کچھ بھاری پڑ جاتا ہے کہیں
کہیں لوگ بالکل کھوسے جاتے ہیں کہ نہ جانے کیا بے تکی سی ہانک رہے ہیں
مگر جب انھوں نے پیشین گوئی کے طور پر کہا کہ ہندستان میں چین کی طرح
انقلاب آئے گا اور ضرور آئے گا اور کوئی طاقت اسے نہ روک سکے گی، تو
کچھ لوگ جو کتنے ہو بیٹھے لیکن سارا بل تالیوں سے گونج اٹھا۔ انھوں نے یہ
بھنی کہا کہ اردو ہندستان سے مٹائے نہ مٹے گی جیسے انگریزوں کی
انتھاک کوششوں کے باوجود ہندستان کی مادری زبان کو شکست نہ دے
سکی۔ اسی طرح اکھنڈ ہندی اردو کو فنا نہ کر سکے گی۔ بلکہ ان دونوں زبانوں کے
میل سے ہمیں ایک نئی زبان کو جنم دینا ہو گا اور وہ ہو گی ہندستانی۔

ایک اجلاس سے دوسرے اجلاس کا درمیانی وقفہ میں نے عموماً
ذنا خانے میں گزارا۔ تین سال پہلے میں نے حیدرآباد کی طالبات کے
درمیان بھی تھوڑا سا وقت گزارا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حیدرآباد کی
لڑکیوں سے بھوپال کی لڑکیاں ایک قدم آگے بڑھ آئی ہیں۔ مثلاً حیدرآباد
کی لڑکیوں نے پوچھا کہ محبت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور میں نے
جواب دیا تھا کہ محبت کے بارے میں قطعی اکسپرٹ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی

مجھے محبت کا موجودہ طریقہ بھی اگر اس میں دیوداسیت ہو تو مقنعی پسند نہیں۔
 محبت ایک قسم کی ضرورت ہے، جیسے بھوک اور پیاس۔ اگر وہ صرف جنسی
 ضرورت ہے تو اسے بھانے کے لئے گھرے کنوٹھی کھودنا حماقت ہے۔ بہنی گنگا
 میں بھی ہونٹ ترکے جا سکتے ہیں۔ رہا دوستی اور ہنجالی کی بنا پر محبت کا دارو
 مدار تو اس ملک کی آب و ہوا اس کے لئے سازگار نہیں۔

بھوپال کی لڑکیوں نے مجھ سے زیادہ تر سوال پاکستان کے مستقبل
 کے بارے میں کئے۔ ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق کوئی حل معلوم کرنا چاہا۔ دو
 چار نے اشتراکیت کے متعلق بھی پھوٹے پھوٹے سوال کئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
 کہ ان کی زندگیوں میں رومان تو ہے مگر کچھ پھیکا سیٹا۔ وہ اب بے باکی سے رومان
 لڑانے کے بجائے کچھ اور بھی کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کیا، یہ انہیں نہیں سوچتا۔
 اب جگر تمام کے بیٹھو مری باری آئی۔ خدا کی پناہ۔ یہ بھیڑ ہے یا
 میری آنکھوں کو ایک ایک کے چار نظر آ رہے ہیں۔ جدھر دیکھو انسانوں کے
 چہرے۔ آج زنا سٹھانے کو گھسیٹ کر بہت دور کوٹنے میں رکھ دیا گیا تھا۔
 مائیکروفون ٹھپ پڑا تھا۔ مگر جاں نثار اختر سنہ میں بھٹونسے دیتے تھے۔
 چونکہ وہ اس کا کرایہ دے چکے تھے لہذا بقول کسی خان اپنا مال کھا ہی نہیں
 رہا تھا بلکہ دوسروں کو بھی کھلا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مائیکروفون گلا
 و بوسے لیتا ہے ایک بار آواز کو نگل لیتا ہے اور پھر بڑھاکر اگلنے کے بجائے
 ڈکار جاتا ہے۔ ہال میں برابر کا ناچھوسی ہو رہی تھی۔ پردے کے پیچھے سے
 بیویاں کھسکھس کر رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے پرچہ ختم ہوا۔

دوسرے اجلاس میں ڈرامہ تھا خاک پلے نہیں پڑا۔ کسی کو اپنا پارٹ یاد نہ تھا۔ پردہ میٹر کی آواز سب پر غالب تھی۔ ستم ظریفی دیکھئے۔ وہ لڑکے صبا جو لڑکی کا پارٹ کر رہے تھے شیو کرنا بھول گئے تھے۔ چونی کسی احمق نے اتنی ڈھیلی لنگائی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب ٹپکی اور جب ٹپکی۔ لڑکیاں تو بیچاری اسی ہول میں مری جا رہی تھیں کہ ڈرامہ سین ہونے سے پہلے چونی ضرور ٹپاک جائے گی۔ لیکن جب ڈرامہ بخیر و خوبی چونی سمیت انجام پا گیا تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اتنی دیر جانوسولی پر لٹکے رہے۔

دوسرا لڑکا جس نے لڑکی بننے کی سعی بلیغ فرمائی تھی سینے پر اتنا گودڑ ٹھونس لایا تھا کہ لڑکیاں شرم اور غصے کے مارے بھنائی جا رہی تھیں۔ دو ایک نے آکر مجھ سے شکایت کی۔

”دیکھئے تو کیسا عورت کا ہیولی بنا کر مذاق اڑایا جا رہا ہے۔“ میں پہلے ہی جلی بیٹھی تھی۔ جی چاہا منہ نوچ لوں کمبختوں کا میں نے کہا ”یہی سزا ہے تم لوگوں کی۔ تم پردے میں بیٹھو اور جی بھر کر بیٹھو اور تمھارے بھوت بنا کر لوگ ایک دوسرے کو ڈرنے کے کام میں لائیں۔ جانتی ہو تمھاری اس پردہ داری نے کتنے دماغوں کو توڑ مروڑ کر الٹ دیا ہے۔ اور تمھیں تو مظلوم بننے کی عادت پڑ چکی ہے۔ مجھے اس ستم کی لڑکیوں سے کوئی بہتر روی نہیں جو خود اپنی مدد آپ کرنا نہ جانتی ہوں۔“ میں نے غدر گناہ کے جواب میں کہا۔

لڑکیوں کے منہ اتر گئے اور مجھے یاد آگیا صفیہ سچ کہتی ہے۔ میرے خمیر میں تیزابیت بہت زیادہ ہے جو صرف دُکھ پہنچا سکتی ہے۔ جو نرم و

نازک سطح کو کھڑونچ والتی ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا آج تو ضرور صفیہ کے قول کو جھٹلا دوں گی اور میں نے اپنے لہجہ میں تھوڑا سا شہد ملانا شروع کیا۔

”آپ ہی سوچئے آپ کے لئے مرد کیا کیا کریں۔ ہاتھ نہیں بٹا سکتیں تو کم سے کم اپنا بار ہی ان کے شانوں سے اٹھا لیجئے۔ مگر اس لکچر بازی میں میرا دل قسطی نہ لگتا۔ ایک بات دیکھی میں نے ان پر وہ نشین لڑکیوں کی آنکھوں میں۔ ان میں لاچاری اور بے کسی کے ساتھ ساتھ اب ایک ہلکی سی رمت جھٹلاہٹ اور غصے کی بھی کبھی کبھی جھلکنے لگتی ہے۔ میں نے سوچا یہ زیادہ دن یہاں نہ رک سکیں گی۔ کچھ تو ان میں ایسی ہیں جو منتظر ہیں کہ کوئی روشن خیال اشرکابندہ انھیں بیاہ کر لے جائے اور جو بھتی بری کے جوڑوں کے ساتھ ساتھ منہ دکھائی میں انھیں آزادی بھی نذر کر دے۔ پھر یہ اس آزادی کو لے کر مزے سے سینماؤں پارٹیوں میں گھوم سکیں گی۔ یہ مجھے باہر گھومتے پھرتے دیکھ کر رشک کر رہی ہیں۔ کچھ لڑکیوں کی آنکھوں میں تو میں نے حد سے زیادہ بے صبری دیکھی۔ وہ اپنی موجودہ فضا سے اتنی گھبرا گئی ہیں کہ اسے ہر قیمت پر چھوڑنے کو تیار ہیں اور وہ اس پہلے شخص کے ساتھ نکل بھاگیں گی جو انھیں یہ سب کچھ دینے کا وعدہ کرے۔

”بتائیے نا۔۔۔ ہم کیا کریں“ انھوں نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا
 ”میں اگر آپ سے کہوں آپ پر وہ چھوڑ دیجئے، تعلیم حاصل کیجئے،
 نوکریاں کیجئے۔ تعلیم بالغان میں دلچسپی لیجئے وغیرہ وغیرہ تو مجھے معلوم ہے کہ
 اس میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ آپ پر دے کی قید میں گرفتار ہیں۔ آپ کی بہنیں

جاہل ہیں۔ آپ کے ملک کے بچے بھوکے ہیں سنگے ہیں۔ نوجوان بے روزگار ہیں بیمار ہیں۔ یہ پردہ یہ جہالت یہ بھوک اور افلاس یہ سب ایک ہی پیڑ کے پھول پتے ہیں۔ یہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ آپ اگر ان پھول پتوں کو ایک بار نوچ کھٹی ڈالیں تو ان میں پھر نئے پتے پھوٹ آئیں گے جن میں اس سے زیادہ گھناؤنے پھل پھول کھلیں گے۔ اس لئے ہمیں جڑوں کے خلاف جنگ کرنی چاہیے،

”ہمیں ان جڑوں کو اکھاڑنے کے لئے کیا کرنا چاہیے“ انھوں نے سوال کیا اور پھر میں سٹ پٹائی۔ یہ لڑکیاں میرا امتحان لے رہی ہیں اور مجھے حقروں منبروں سے بھی پاس ہونے کے رونے پڑے ہیں اور ان کے اس چھوٹے سے سوال کا جواب بھی نہ دے سکی اور میرا سر مذمت سے جھک گیا۔ ہمارے پاس کوئی بھی ایسا پردہ گرام نہیں جسے ہم اپنے نوجوانوں کے سامنے پیش کر سکیں کوئی راستہ ایسا نہیں جس کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیں ”اوہریدھے چلے جاؤ“

”لپ لڑیچر پڑھیے“ میں نے چاہا اس وقت انھیں آسان سانسو پکڑاؤں جسے یہ استعمال کریں۔ دوسری کوئی پیٹنٹ دوا تیار ہو ہی جائے گی حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ لڑکیاں بھلا کیا پڑھ سکیں گی۔ یہ عمر یہ فضا یہ ماحول۔ یہاں تو بس قصے کہانی اور ناواں ہی کی ٹھپت ہو سکتی ہے اور پھر میرے خمیر کی تیزابیت نے زور مارا۔ کل ہی تو کسی لڑکی نے مجھ سے کہا تھا یہاں زیادہ تر لڑکیاں روسا اور کھاتے پیئے لوگوں کی ہیں۔ لاحول ولاقوۃ میں نے استری سدھار کا پرچار کیوں شروع کر دیا۔ سدھار میرا مقصد ہی نہیں

اس کھنڈر کی مرمت میں جان کھپانا حماقت ہے۔ اسے تو وٹھا کئے ایوان بنانے ہوں گے۔ بہت دن مرہم سچی کر لی اب نشتر کی ضرورت ہے جو تیز بھی ہو اور پھر تیلابھی، مگر میرے پاس لڑکیوں کی بات کا کچھ تو جواب ہونا چاہیئے میں نے سوچا۔ اس وقت باہر بھاگنا چاہیئے۔ باہر مردوں نے میں بڑے بڑے سور ماسیٹھے ہیں شاید ان لڑکیوں کو چیت کرنے کا کوئی داؤں بتا دیں کرشن چندر سے پوچھوں گی وہ ضرور بتا دیں گے۔ جب باہر آئی تو کرشن چندر طلباء کے زنگے میں گھرے فرما رہے تھے۔

”بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے سامنے کوئی تعمیری پروگرام نہیں ہے یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے لیکن وہ ہی مثالی ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے اور کیسے باندھے۔“

میں نے کہا ”تو بھی مسیحا خود گرفتار ہلا ہیں“

تیسرے دن مہندز ناٹھ نے صدارت کی۔ ان کا خطبہ صدارت زنا خانے میں بڑے ہی اہمک سے سنا گیا۔ کیونکہ وہاں زیادہ تر نوجوان لڑکیاں تھیں۔ جو کچھ مہندز نے کہا اس سے بہت قریب تھیں اور کرشن چندر اور شاہد لطیف کے خطبہ صدارت سے زیادہ سمجھ رہی تھیں۔

جوں جوں شام ہوتی گئی مجمع بڑھتا گیا۔ آج عورتوں کو گھسیٹ کر بالکل اسٹیج کے قریب کر دیا گیا تھا۔ آج وہاں سے خوب صاف سنائی دے رہا تھا۔ بھوپال کے لوگ مشاعرے کے بہت زیادہ شوقین معلوم ہوتے ہیں خاص طور پر خواتین تو آج بہت آئی تھیں۔ پونے بارہ بجے مشاعرہ غزلوں پر

نظموں کے بل بوتے پر گھسٹتا رہا۔ ترقی پسند شعر کی صف میں ایک تو مجروح تھے جو بطور تبرک کے وقت آخر کے لئے رکھ چھوڑے گئے تھے۔ جوش صاحب جو کہ بارہ بجے کی گاڑی سے لکھنؤ سے آرہے تھے، آہی نہ چکے تھے۔ ایک تو مشاعرہ ویسے ہی کچھ سویا ہوا تھا۔ دوسرے میرے اور صفیہ کے بچے جاگ رہے تھے۔ سوائے حضرت تاباں کی نظم ”یوالی“ کے اور کسی چیز کا لطف نہ اٹھا سکے۔ بھیڑ اور غل میں بچے بوکھلا بوکھلا کر ہم دونوں کا ناطقہ بند کئے دیتے تھے کہ اتنے میں شور ہوا، ہٹو بچو۔ جوش طبع آبادی زندہ باد....

..... شاعر انقلاب زندہ باد..... اور ہم نے دیکھا کہ شاعر انقلاب صفوں کو چیر کر ایٹیج کی طرف لئے جا رہے ہیں۔

جب جوش صاحب مندر پر براجمان ہو گئے تو صفیہ اختر نے اٹھ کر ایک چھوٹا سا سپانامہ پر دو نشین طالبات کی طرف سے جوش صاحب کی خدمت میں پیش کیا اور ایک گونے کا ہار اپنے لرزاتے ہوئے ہاتھوں سے ان کے گلے میں آویزاں کیا۔ ہال تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھا اور ہمارے بچے دل کر رونے لگے۔

اب کچھ اکھاڑہ جیتا نظر آیا، مجاز اور ساحر جن کی جوش صاحب کے ساتھ آنے کی امید تھی، معلوم ہوا کہ وہ نہ آ سکے۔ ساحر کو تو بخار آ رہا تھا اور مجاز..... ان کے بارے میں تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی غیر حاضری کا تو اب ہمیں عادی ہو جانا چاہیے۔ خیر! کچھ مجروح نے سنبھالا اور جوش صاحب تک مشاعرے کو پہنچا دیا۔ ایک تو لمبے سفر کی ٹھکان، دوسرے کچھ دھلتی رات

جوش صاحب کچھ چڑے ہوئے سے نظر آ رہے تھے، نہ جانے کیا گر بڑ ہوئی اور
مشاعرہ ایک دم ختم ہو گیا۔

جب سے مصرع طرح کا فیشن اٹھ گیا ہے شعرا نے مشاعروں میں نئی
چیزیں پڑھنے کا فیشن بھی اکٹھا دیا۔ سب وہی اپنی پرانی چیزیں اٹھا کر سنا
دیتے ہیں۔ اس پورے مشاعرے میں سوئے تاباں کی دیوالی کے میں نے
تو ہر چیز پہلے ہی سے سُن رکھی تھی، لہذا کچھ مزہ نہ آیا۔ یہ دیکھتے پھر تیزابیت
نے زور مارا۔

جاں نثار نے دوسرے کمرے میں جوش صاحب کو ٹھہرا دیا۔ اُن
کے ساتھ کوئی اور صاحب بھی تھے۔ صفیہ نے اپنے اور جاں نثار کے پلنگسٹ
اٹھا کر ان دونوں کے لئے دوسرے کمرے میں لگوا دیے اور خود بچوں کو
لے کر فرش پر سونے کا انتظام کر لیا۔ اس کا بس چلتا تو اپنے شوہر کے گرد دیو
جوش صاحب کے لئے اپنی کھال بھی اُتار کر بچھا دیتی۔ آج وہ بے انتہا خوش
تھی، اس کے گھر میں ہندستان کا سب سے بڑا شاعر جلوہ افروز تھا۔ اس
جوش و خروش کے سلسلے میں کھانا پکوانا بھی بھول گئی۔ اب اس پر لرزہ چڑھا
کہ اگر جوش صاحب کھانا مانگا بیٹھے تو کیا ہوگا؟ میں نے اس کو صلاح دی
کہ صفیہ! جوش صاحب بڑے بھولے آدمی ہیں۔ اگر ان سے کوئی زور دے کر
کہے کہ وہ کھانا کھا چکے ہیں تو وہ فوراً مان جائیں گے، لیکن جوش صاحب
واقعی ریل میں کھانا کھا کر آئے تھے۔

صبح سویرے ہم لوگ سوہی رہے تھے کہ پاس کے کمرے سے جوش صاحب

کے رباعیاں پڑھنے کی آواز آئی۔ صفیہ نے ہمیں جھنجھوڑ کر جگایا اور منہ پر پھپکا مار کے ہم ان کی خدمت میں پہنچ گئے۔ جوش صاحب نہلے دھولے صاف سمھڑے کپڑوں میں شعر مجسم معلوم ہو رہے تھے۔

یہ شاعر بھی عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ خاص طور پر یہ نئے شاعر۔ مخرج قطعی شاعر نہیں لگتا، فرسٹ ایر کا طالب علم معلوم ہوتا ہے۔ جعفری کا ناک نقشہ ان عربی و فارسی کے الفاظ سے کتنا دور نظر آتا ہے جو اس کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ کیفیت کو دیکھ کر شبہہ ہوتا ہے کہ اسے ابھی گھڑے میں سے نکال کر کھڑا کر دیا گیا ہے اور کوئی دم میں اُونگھ کر گر جائے گا لیکن جب وہ اپنے اشعار پڑھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وجود ایک وبے ہوئے اسپرنگ کی طرح اچھل کر اُپر آ رہا ہے۔ مجاز کو دیکھ کر یہ شبہہ بھی نہیں کہ یہ خون کی آندھیاں چلا سکتا ہے لیکن جوش صاحب زندگی میں بھی ویسے ہی چاق و چوبند اور گریہ دار نظر آتے ہیں جیسے اپنی شاعری میں۔ اور اس وقت کچھ نوڈ میں بھی تھے۔ گزشتہ شب کے مشاعرے سے کبیدہ خاطر نظر آ رہے تھے۔

دوپہر کا کھانا ہم سب نے اختر سعید کے ہاں کھایا۔ وہاں سے احسن علی ہم لوگوں کو اختر جمال کے ہاں لے گئے۔ اختر جمال بھوپال کی ان خوش نصیب لڑکیوں میں سے ہیں جن کے والدین روشن خیال ہیں اور انھوں نے اپنی اولاد کو آزادی دے رکھی ہے۔ ہمیں یہ اندازہ نہ لگا سکی کہ ان لڑکیوں نے اس آزادی کو استعمال کرنے کا کیا پروگرام بنایا ہے۔ وہاں سے ہم لوگ کافی کلب گئے جہاں مجلس استقبالیہ کی طرف سے ہم لوگوں کو ایٹ ہوم دیا گیا تھا۔

رات کو قریب کے کمرے سے جوش صاحب کی صدارت میں منعقد ہونے والے گھریلو مشاعرے نے ہم لوگوں کو بھی کھینچ بلایا۔ جوش صاحب بڑے موڈ میں تھے اور ڈانٹ ڈانٹ کر سب سے واوے رہے تھے۔ میں نے پہلی دفعہ جوش صاحب کو ان کے اپنے اصلی رنگ روپ میں دیکھا۔ گزشتہ شب کے مشاعرے کی کڑواہٹ اب تک ان کے منہ میں تھی اور یونین کی طرف سے جو مشاعرہ ہونے والا تھا، اس میں قطعی شریک ہونے کو تیار نہ تھے، لیکن لوگ کہیں چھوڑنے والے تھے۔

دوسرے دن میں نے سوچا تھوڑی دیر کو حمیدہ سلام الدین کے ہاں ہو آؤں ورنہ وہ تاراض ہو جائے گی۔ میں وہاں جا کر بیٹھی ہی تھی کہ اختر سعید صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ ”سب لوگ ساپچی جا رہے ہیں“ میں نے کہا اٹھلا جا بکے ساپچی جا رہے ہیں تو پھر لوٹیں گے کس وقت؟ کہنے لگے وقت کی کوئی پروا نہیں۔ ساپچی جا رہے ہیں اور لوٹ ہی آئیں گے کبھی نہ کبھی۔ میں نے دل میں سوچا۔ بھوپال آئے اور ساپچی کے استوہیں نہ دیکھے تو کچھ بھی نہ کیا۔ ویسے ہی ساری دکانیں بند ہیں۔ بٹوے بھی ملنا مشکل ہیں۔

لیکن گھر آکر معلوم ہوا کہ جوش صاحب بحالت اور طے قیلولہ فرمانے پر مضر لیٹے ہیں اور کسی طرح چلنے پر راضی نہیں ہوتے، صفیہ اور جان نثار جانو بیٹی بیاہ کر گئے ہیں، لہذا تھکے مانے پڑے ہیں۔ شاہد کو بھی نیند آرہی ہے لیکن کرکشن چندر ہندو ناٹھ، عادل رشید اور ادھوکار لاری میں ڈٹے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں ہم ساپچی جا کر رہیں گے۔ اختر سعید احسن علی بھی ان کے

ہم نوا ہیں۔ جوش صاحب کے پاس دند کے بعد دند بھیجا جا رہا ہے گردہ لٹس سے
مس کہنیں ہوتے کرشن نے کہا ہم جوش صاحب کے بغیر جائیں گے اور لاری
اٹارٹ کرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں عسکری صاحب اوپر سے چلائے "ٹھہرو
ٹھہرو جوش صاحب اٹھ رہے ہیں۔"

پندرہ منٹ گزر گئے۔

ہم لوگ پھر پہنچے کہ ہم جا رہے ہیں۔

اوپر سے آواز آئی "جوش صاحب واقعی اٹھ بیٹھے۔"

پندرہ منٹ اور گزر گئے۔

اب صبر کے پیمانے چھلک گئے مگر پھر کسی نے اطلاع دی "جوش

صاحب زینے میں ہیں۔"

پھر دس منٹ کا غوطہ !

اور جوش صاحب زینے میں۔

مگر اس سے قبل کہ پیمانے الٹ جاتے جوش صاحب مع تمام جہام کے

واقعی زینے میں آگئے۔ موہاں نثار اختر، صفیہ عسکری اور شاہد کے دونوں

سیٹوں کے بیچ میں ایک گدا ڈال کر ایک گاؤ تکبہ لگا دیا گیا اور شاعر

انقلاب برا جمان ہو گئے۔

ہم کسی معمولی لاری میں نہیں جا رہے تھے بلکہ ہسپتال سے ایک

ایمبولنس مستقاری گئی تھی۔ کم سخت اس قدر غل مچاتی کھڑکھراتی چلتی تھی کہ

مردے بھی جاگ پڑتے ہوں گے۔ تین چار میل گئے ہوں گے کہ اس نے

ہچکیاں لینا شروع کر دیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ مریضوں کی صحبت میں رہ کر کمبخت خود بھی ادھ مری ہو گئی تھی۔

۱ ”گھج گھج..... گھسچ“ مریضہ بولی

”یہ گاڑی نہیں چلے گی صاحب“ ڈرائیور نے نہایت ہی کھڑے پن سے کہا۔

”ہیں؟ چلے گی کیسے نہیں“ اختر سعید نے ڈانٹا۔

ڈرائیور نے کوئی نہایت ہی مثنوی قسم کا نام لے کر بتایا کہ وہ آلہ نہیں ہے اور پٹرول میں کچرا آ رہا ہے، گاڑی رک گئی ہے۔

ڈرائیور کچھ اڑ پڑ کرنے لگا۔ سب نے اترا کر اپنی کمر سیدھی کی۔ ایک ہی جھٹکے میں کمبخت جوڑ جوڑ ہل گئے تھے۔ صفیہ نے کہا ”آج احسن علی کو کیا ہو گیا“ اور ہم دونوں نے دیکھا کہ وہ کچھ عجیب رمانٹک انداز میں کھڑے ایک پیڑ کی بلندی ناپ رہے تھے۔ اتنی میں گاڑی ٹھیک ہو گئی اور چل پڑی۔ کوئی آدھ میل گئے ہوں گے کہ پھر وہی گھٹی گھٹی ہچکیاں۔ مگر اختر سعید اندر سے غرتے اور گاڑی چلتی رہی۔ ادھر میں نے ڈرائیور کی صورت دیکھ کر کہا ”صفیہ ڈرائیور کو کیا ہو رہا ہے۔ اس کے چہرے کے بیچ کیوں کستے جا رہے ہیں۔؟“

ملٹری کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بڑا غصہ آ رہا ہے اسے۔
ڈرائیور نے شاید ہماری کھنسر پھنسن لی۔ گاڑی پھر رک گئی۔ پھر کچرا۔
— اور مجھے — نیاز حیدر یاد آگئے ”ہٹاؤ کچرا“

اختر سعید بھٹا اگر اُترے ڈرائیور کو گھوڑا اور گاڑی کی سیکینئر سمجھنے کی
 دھمکی دینے لگے۔ صفیہ نے مجھے کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا "وہ دیکھو" اور میں نے
 دیکھا کہ احسن علی سپر پیڑوں کی بلندیاں ناپ رہے تھے۔
 "معلوم ہوتا ہے اس شخص کو کسی سے عشق ہو گیا ہے۔" صفیہ نے
 نبض بازوں کی طرح کہا۔

احسن کی آواز میں لکڑا رہے۔ الفاظ جی دار ہوتے ہیں۔ خیالات
 بے چین اور پھڑکتے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب احسن بولتا ہے تو نہ جانے کیوں
 علی سردار جعفری یاد آ جاتا ہے۔

صفیہ اور میں سوچنے لگے کہ کیا بات ہے کہ عشق کرتے وقت سب
 فرودگیاں ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انھیں اپنے مسلک اور اس کے طور طریقے
 بالکل یاد نہیں ہوتے۔ ایک شاعر، ایک ادیب، ایک کمیونسٹ بھی جب عشق
 کرتا ہے تو آسمان ہی کی طرف نکلتا ہے لیکن مزدور اور کسان جب عشق کرتا ہے تو
 تارے نکلتا اور پھول سوگھ کر آہیں بھرتا ہے۔

"ارے کیوں بے چارے کے سر طوفان جوڑ رہی ہو۔ اس کے یہاں
 تو غم جاناں کبھی کا غم دوراں بن چکا ہے۔" صفیہ نے کہا۔

گاڑی پھر چل پڑی اور اب کے بڑی دھوم دھام سے چلی۔ شاید
 مریضوں کو دار فانی پہنچانے کی عادی ہو چکی تھی۔ کیونکہ جس طوفانی رفتار سے
 ہم سب کو جھکولتی، کھڑکھڑاتی اور غل مچاتی جا رہی تھی۔ اس سے تو یہی اندازہ
 ہوتا تھا کہ ہم لوگوں کا آخر وقت آگیا ہے۔ بیچا پسے جوش صاحب گاؤں تک پہنچے

اپنے مجسم کو تولے پیٹھے تھے۔ اور سب بھی اپنا سر ایک دوسرے کے سر سے پھوٹ جانے کے ڈر سے بے چین سے نظر آ رہے تھے۔

”جوش صاحب بڑے خوبصورت ہیں“ میں نے چپکے سے صفیہ کے کان میں کہا۔

”شش۔ چپ کیا غضب کرتی ہو، جوش صاحب سن لیں تو؟“

”میری بلا سے سن لیں..... کیوں جی جوش صاحب

اور ان کی برادری کے لوگ تو عورت کے حسن کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیں اور ہماری جبین پر شکن بھی نہ پڑے یا اور اگر میرے منہ سے جوش صاحب کے حسن سے مغلوب ہو کر ڈوبول نکل جائیں تو وہ برا ملنے کی دھمکی دیں۔“

”اٹ فوہ!..... کیا مصیبت ہے۔ تم سے بات کرو تو

جھار کا کاٹا اپنی جان کو لگا لو..... بھئی یہ کچھ قابل تعریف بات نہیں سمجھی جاتی کہ عورتیں مرد کے حسن پر لٹو ہوتی پھریں۔“

”تو پھر تمہاری رلے میں عورتوں کو ہاتھتی گھوڑے کے حسن پر لٹو ہونا

چاہیے مجھے قطعی تمہاری بات سے اتفاق نہیں۔ عورت کو مرد کے حسن کی تعریف کر بے کا پورا پورا حق ہے اور اب تو مجھ سے کرشن چندر نے بھی کہا ہے کہ ایک افسانہ یا مقالہ مردوں کے حسن پر لکھوں اور ویکہ لینا میں اسے پہلی فرصت میں لکھوں گی..... میں اس میں مرد کی ناک کے بالوں کا لطیف ذکر چھیڑوں گی اس کی موچھ کی نوک کو خنجر ابدار سے بھی زیادہ ہلاکت آفریں ثابت کر دوں گی

اور اس کی ڈاڑھی کو سانولی سلونی شاموں میں اُمنڈنے والی گھٹاؤں سے تشبیہ دوں گی جس کی پہنائیوں میں عورت کا دل جنگلی کبوتر کی طرح پھنس کر پھڑپھڑاتا ہے اور جیسے ہزاروں اشعار عورتوں کی چولی اور اس کے بند اور نکلنے کی شان میں کہے ہیں، اسی طرح میں مرد کے لنگوٹ اور.....

”ہائے ہائے..... کم بخت..... مر جاؤ..... موت آئے بھقیں“ صفیہ نے زور سے میرا منہ مسل دیا اور سر سے پیر تک لرز اٹھی۔

”جب ہی تو لوگ بھقیں فحاش کا الزام دیتے ہیں.....“

ایمبلنس نے پھر ہچکیاں لیں اور ہم مردوں کے حسن کے نقطے سے پھسل کر منہ کے بل گرتے گرتے بچے۔

”صاحب موٹر اگر گئی تو واپس نہ لوٹ سکے گی۔ ویسے آپ کہتے ہیں تو چلنے کو تیار ہوں“ ڈرائیور نے مودب بننے کی کوشش کی۔ اگر وہ ذرا صاف گو ہوتا تو کہتا ”احمقو! بھلا شام کے چھ بجے ساپگی کے ٹوپ دیکھنے جا رہے ہو سٹر میل کا سفر نہ ساتھ کھانا نہ پانی۔ میں بھقا رہا ہی خواہ ہوں اس لئے کہتا ہوں کہ کیوں خواہ مخواہ دہاں جھاک مارنے جا رہے ہو“

”کیوں! کیا پھر موٹر بگڑ گئی؟“ اختر سعید غراے۔

”بھئی واپس چلو“ کرشن نے کہا ”ڈرائیور کا دل نہیں کہتا جانے کو۔“

”مجال ہے اس اُتو کے پٹھے کی“ اختر سعید جھبلائے۔

ڈرائیور نے چہرے کے پیچ اور بھی کس لئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا
”تمہاری مرضی پھر مجھ سے شکایت نہ کرنا میں قطعاً ایسے پاگل وقت ساپچی جانے
کو تیار نہیں۔“

”ایسا ہے تو پھر واپس چلو بھئی“ جاں نثار نے ڈرائیور کی معنی خیر خاموشی
سے سہم کر کہا۔

”اب کے نہیں بگڑے گی“ ڈرائیور نے شرارت سے مسکرا کر اطمینان
دلایا۔

”ارے احسن علی کہاں گئے کسی نے یا دولا یا۔ بڑی مشکل سے موٹر کی
اور واپس لوٹائی گئی۔ احسن صاحب ایک چھپی کی شہنی لئے سڑک پر کھڑے
آسمان کو تاک رہے تھے۔ سب بیچاپے کو ڈانٹنے لگے، مگر وہ خاموش ہے
ساپچی جانے کا سارا موڈ ختم ہو گیا۔ سب کی ہی رائے ہوئی کہ بخیر و عافیت جلد
از جلد گھر پہنچنا چاہیے۔ تیس چالیس میل کا چکر لگا کر لوٹ آئے۔ یہ ہوئی ساپچی
کی سیر۔“

کانفرنس ختم ہونے کے بعد آج پہلے دن ذرا صفیہ سے گپ شپ
کا موقع ملا۔ پر نہ جانے بازو کے کمرے میں لوگ کیا سرگوشیاں کر رہے تھے کہ
ہمارا حجب نہ لگا۔ عجیب پر اسرار قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔ کھسکھس اور
پھر ایک طویل تہقہ۔ میں نے اور صفیہ نے فیصلہ کیا کہ گیلری میں چپکے سے
جا کر سنا جائے۔ اب ڈریہ تھا کہ ہمارے بدتمیز بچے وہاں ساتھ جا کر ہمارے وجود
کا اعلان کر دیں گے اور ہم پر ان تہقوں کا بھید نہ کھل سکے گا۔ بڑی مشکل سے

اُن کم سختوں کو بہلا پھسلا کر نوکر کے سپرد کیا اور خود گیلری میں دب کر بیٹھ گئے
گیلری میں پہنچ کر جو کچھ سنا تو ہم پر چودہ طبقہ روشن ہو گئے۔ ترقی پسند مصنفین
کی کانفرنس کے چند رکن سر جوڑے بالکل اس ہی موضوع پر اشعار سنا
رہے تھے جس پر ہمارے گھر کی پکی عمر کی بہو بیٹیاں چھٹو جان سے لطیفہ سنا کرتی
تھیں۔

یہ چھٹو جان دلی کی طوائف تھیں۔ ہماری مافی جان کی بڑی منہ چڑھی تھی
اس اند کی بندی کو ایسے ایسے پرائیوٹ لطیفے یا دتھے عورت اور مرد کے پوشیدہ
تعلقات پر مختلف من گڑھت فتنے جنسی و زندگیوں کے متعلق سننی خیر لطیفے۔
اونچے گھرانے کی بھلی بے جان وہ جو لڑکیوں کے سر سے اگر درپٹہ دھٹاک چلے
تو سات سو طوفان جوڑنے لگیں۔ انھیں سُن سُن کر کلکاریاں مارتیں اور لوٹ
پوٹ ہو جاتیں۔ نہ جانے کیوں ان باتوں کو سُن کر مجھے پنجاب کے نننگے جلو س
یاد آ گئے، وہ سڑکوں پر زنا اور عورت کی بھیا ناک تخریب کی تصویر آنکھوں میں پھری
جیسے دونوں ایک ہی جذبے کے لئے تخلیق کئے گئے ہیں۔ پھر صفینہ نے مجھے
بتایا کہ قریب قریب تمام چوٹی کے شعرا کا اس قسم کا کلام پرائیوٹ اور بے تحلف
موتوں پر لطف اندوز ہونے کا بہترین نسخہ ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ مشغلہ گھر
میں بیٹھے والی ناکارہ عورتوں ہی تک محدود ہے۔ مرد تو سیاست اقتصادیات
اور معاشیات پر بحث و مباحثہ کرتے ہوں گے۔ لوگ منو پر فحاشی کا الزام لگاتے
ہیں۔ اگر کہیں وہ یہ سب کچھ لکھ دے تو اسے توپ دم کر دیا جائے۔ اور اگر میں
وہ سب کچھ لکھ دوں جو مغز بیویاں پٹھارے لے کر سستی اور سستی ہیں، تو نہ جانے

لوگ میرا کیا حال کریں۔ مگر یہ سب باتیں خلوت میں ہوتی ہیں تو انھیں ادب کی ایک پر لطف شاخ سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کوئی ان کا بھانڈا پھوڑنے کے لئے منظر عام پر لے آئے تو لوگ پارسا بیویاں بن کر ناک سکیڑنے لگتے ہیں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کے اشعار کا ایک بہت ضخیم خزانہ موجود ہے جو بالکل شاہی نسخوں کی طرح سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے۔ بے چارے چرکین کا حشر دیکھنے کے بعد لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر شایع کیا گیا تو لوگ اسے چوراہے پر ڈال کر جوتیوں سے پیٹ کر ختم کر ڈالیں گے۔ لہذا بہتر ہے کہ اسے ذہنیت کی پرورش کے لئے دماغوں تک ہی محدود رکھا جائے۔

سوال یہ ہے کہ یہ فن کیوں ظہور میں آیا۔ یہ تو میں کسی حالت میں بھی ماننے کو تیار نہیں کہ غم و غصہ، نفرت اور محبت کی طرح یہ صنفی درندگی بھی انسانی جبلت ہے۔ یقیناً یہ شاہی نظام کے تحفے ہیں۔ امراء اور روسا رجب جسمانی عیاشی سے جس کی آخر کو ایک حد مقرر ہے اور تمام طلائی اور گولیاں عاجز آجاتی تھیں تو وہ ذہنی بدکاری ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ بڑے درباروں میں اس قسم کے سامان ننگی قصویروں، کوک شاستروں، اشعار اور لطیفوں کی صورت میں فراہم کئے جلتے تھے جو اکتائی ہوئی زندگی میں تھوڑی سی جان پڑ جاتی تھی۔

پر انے کپڑوں اور چھوڑی ہوئی ہڈیوں کے ساتھ ساتھ یہ نعمت مصاحبین کے گھر تک آئی اور وہاں سے ان کے مصاحبوں میں رینگ گئی اور اب ان کے تھو کے ہوئے نوالے ہمارا انقال طبقہ چباتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اب وہ

لوگ جو انقلاب کے علمبردار بنتے ہیں۔ اس ذہنیت سے کس طرح سمجھوتہ کرتے ہیں؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور میرا دل بے طرح ادا اس ہو گیا۔ آخر چھوڑو ان باتوں کو جب سب کچھ بدل جائے گا تو ذہنیتیں خود بخود بدل جائیں گی۔ جڑ بدلنے کے بجائے پتوں کی کاٹ چھانٹ میں وقت گزارنا حماقت ہے اس طبقے کے کیرٹے مارنا فضول ہے۔ جڑ بدل گئی تو پھر نئی ٹہنیوں میں نئے پتے اور نئے پھول کھلیں گے۔

مبہمی آکر معلوم ہوا کہ علی سرور جعفری رہا ہو گئے، معلوم ہوتا ہے محکمہ بالائے کچھ گھسٹا ہو گیا تھا یا شاید بھول چوک ہو گئی۔
بھٹاؤل کے ترقی پسند مصنفین کو میرا پیغام ہے کہ آپ کے کہنے کے مطابق ہم نے میدان رجعت پسندی کے قبضہ میں نہ جانے دیا۔ بات یہ تھی کہ وہاں کوئی سامنے آیا ہی نہیں۔ لہذا میدان جیت آئے ہیں۔

چوٹھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بھی مٹی۔ ٹوٹی پھوٹی
کھیرل کی بھریوں میں سے دھوپ کے آٹے ترچھے قتلے پورے والان میں بکھرے ہوئے
تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں جیسے کوئی بڑی دارو
ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگائے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منہ نہی سا چڑچڑا
بچہ رسد کی کمی کی دہائی دیکر چلا اٹھتا۔

”نائیں نائیں میرے لال“ دہائی پٹی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر بوں بلاتا
جیسے دھان۔ ملے چاول سوپ میں چھٹاک رہی ہو، اور بچہ ہنکا لے بھر کر خاموش ہو جاتا۔
آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکرہ ہرے کو تک رہی تھیں۔
چھوٹے عرصہ کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونٹے
کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت
اوپر تھا، ان کے سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے بھیر سنوارے تھے، کتنے
چھٹی چھو چھک تیار کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونٹے تھے۔ جہاں کہیں محلہ میں
کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی اس کے پاس کیں لایا جاتا۔

کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلفت توڑتیں، کبھی تکون بناتیں کبھی چوکھٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔
 ”آستین اور گھیر تو نخل آئیگا، گرہ بیان کے لئے کترن میری بھتیجی سے لے لو اور شکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی پھوٹا تھا۔ اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہمارے گئے گی، جب ہی تو سب دم سادھے اُن کا منہ تاک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی، چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے پیوست رہی تھیں، لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں رزد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اُداس اُداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں، جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو، اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔

محلہ والیوں کے جگمگ سے ایک لمبی اطمینان کی سانس اُبھری۔ گود کے بچے بھی ہٹک دیے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپا جھپ سوئی کے نالوں میں دُورے پر دیئے۔ نئی بیاہی دہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لکٹائیے، متھیلی پر ٹھوڑی رکھتے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دو پہر کا کھانا نمتا کرا سی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بھتیجی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بھٹی برتن مابھتی

ہوئی کبریٰ کن انجھوں سے اُن لال کپڑوں کو دکھیتی تو ایک سُرخ چھپکلی سی اس کے
 زردی مائل مٹیلے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پوے پوے
 ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان
 بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔ گہری صندوق جینی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس
 نسفی نسفی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا، ہر ٹانگے پر زری کا کام بہتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔
 یاد نہیں کب اس شبنمی دوپٹے کے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑی کے بھاری قبر

جیسے صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کر نیں
 ماند پڑ گئیں۔ طولی کے بچے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا
 ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا، اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ
 نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دھن چھانٹی جاتی۔ سردی
 کے چوکے پر صاف ستھری جازم بھیتی۔ محلہ کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور غبلوں میں
 بچے دبلے جھانکھیں بجاتی اُن پہنچتیں۔

”پھوٹے کپڑے کی گونٹ تو اُتر آئے گی، پر بچوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔“

”لو بوا۔ لو اور سنو۔ تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟“ اور پھر سب کے
 چہرے فکر مند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیاگر کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و
 عرض نہایتیں، اور بویاں آپس میں پھوٹے کپڑے کے متعلق کھسکھس کر کے قہقہہ لگاتیں
 ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی، کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سم دھنوں
 کو گالیاں سنانے لگتی، بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں
 پر کٹواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر دھانک کر کھپری میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا

اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے اُبھرتا تو بے چارے یاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ! یہ قہقہے انھیں خود کب نصیب ہوں گے

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کو عٹری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلہ پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی تست بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی، کوئی جوڑا اسرارِ چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لوٹاؤن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑکھانگے گا۔ یا تو دولہ کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑکھانگہ بندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آجلے تو سمجھ لویا تو ہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پاؤں کے پناگ پر جھگڑا ہوگا۔ جو بھتی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑا پا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم کے زور سے سگھڑماں نے جہیز جوڑا نام شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کتر بھی جچی تو تیکے دانی یا شیشی کا غلات سی کر دھناک گو کر دے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیہ بے کھرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو برات آگئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے آبا گزرے سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے آبا یاد آگئے۔ آبا کتنے دُبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھاک جاتے تو یرھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اُٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسا حلق میں چلا جاتا

اور وہ کھانتے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگر کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعاً پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح ابھرتی۔ جیسے گردن کٹے کبوتر۔ پھر پھر اسے ہوں۔ پھر فی آناں آکر اُنھیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

”تو یہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی؟“

اُچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر آبا جیسی سے مسکراتے کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہنپا کرتے۔

”کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے۔ کتنی بار کہا تم سے۔“

”بڑے شفا خانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ۔ اور روز میں پاؤں دودھ اور آدھی پھٹا ناک کھن۔“

”اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی، اور بے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھا دے کسی۔“

”دکھاؤں گا“ اباحقہ گڑ گڑاتے اور پھر اُچھو لگتا۔

”آگ لگے اس موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جو ان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔“

اور اب آبا بکری کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبری جوان تھی۔ کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اس کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سادنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کر نہیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں، نہ اس کے

سینے پر طوفان اٹھٹے اور نہ کبھی اس نے سادہ بھادوں کی گھٹاؤں سے محل محل کر
پرستم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دیے پاؤں اس پر
رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی، میٹھا برس نکمین ہوا اور
پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے۔ اور انہیں اٹھانے کے لئے
کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے صند کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں
کہ اس ٹاٹ کے پروے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک
نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز د پر کوسہ دری میں رنگ
برنگے کپڑے پھیلا کر گر دیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں

کہیں نہ کہیں سے جو جمع کر کے شبرات کے پہینے میں کرپ کا دوپٹہ
ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا
منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آ رہا
ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے اک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات
آن کھڑی ہوئی اور انہوں نے ابھی دھن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول
سے تو ان کے چپکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ
”بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آوے۔“

اور پھر دونوں میں کھڑے پھنس رہی تھی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چادر پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کا نا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بنی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھرگو کر دو چھ ماشہ سلسہ تارا اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لادیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ حقوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے لمبھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو سالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

”اللہ! میرے اللہ میاں! ابکے تو میری آپا کا نصیب کھل جائے۔ میرے اثر میں سورکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔“ حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی صبح جب راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے پھروں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سیوٹیوں اور پراکھٹوں کا ناشتہ کر کے بیٹھا کہ میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دھن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کو ٹھری سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھائے۔

”لاؤ میں دھو دوں بی آپا“ حمیدہ نے شرارت سے کہا

”نہیں“ وہ شرم سے جھجک گئی۔

حمیدہ چھوٹی رہی، بنی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپٹا ٹانگتی رہیں۔

جس راتہ کان کی لونگیں گئی تھیں اُسی رستے پھول، پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دُود چوڑیاں بھی جو سنبھلے ماموں نے رنڈا پا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر اُسے دن راحت کے لئے پراٹھے تل جاتے کوفتے بھنا پلا دے مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے آمار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

”زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی“ وہ حمیدہ کو منہ پھلانے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی ”ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اُٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلمتی ہے۔ دوڑا دشتاتی ہے تاکہ موٹی سی بلائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے۔ اور کیوں نہ بھرے، آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کما ہے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سنبھالتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طنز دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا۔ اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اُٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ اس کے کپڑوں کو پیار سے تہ کمر میں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوئیں، بساندی بنیان اور ناک سے لبرٹے ہوئے رد مال صاف کرتیں۔ اس کے تیل میں چھپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر سٹو بٹ ڈریم کاڑھتیں، پر معاملہ چاروں کو نے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح اندھے پراٹھے دُٹ کر جاتا اور شام کو اگر کوفتے کھا کر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں

کھس پھس کر تیں۔

”بڑا شرمیلا ہے بیچارہ“ بی اماں تاو دیلیں پیش کر تیں ”ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھی کچھ تو پتہ چلے رنگ دھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔“

”اے فوج، خدا نکے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے، اس کا انخیل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے“ بی اماں فخر سے کہتیں۔

”اے تو پردہ توڑوانے کو کون کہے ہے“ بی آپا کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انھیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی۔

”اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوری کون سی بکرید کو کام آئے گی“ دو میری طرف دیکھ کر ہنستیں ”اری اونک جڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی مہنسی مذاق، اونھ، اری چل دیوانی۔“

”اے تو میں کیا کر دوں خالہ؟“

”راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟“

”بھیا ہمیں تو شرم آتی ہے۔“

”اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھلے گا نا؟“ بی اماں چڑھ کر بولتیں۔

”نہیں تو۔ مگر.....“ میں لاجواب ہو گئی اور پھر مسکوت ہوئی۔

بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں چپکے سے بولیں،

”دیکھو مہنسا نہیں نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔“

”نہیں مہنوں گی“ میں نے وعدہ کیا۔

”کھانا کھا لیجئے“ میں نے چوکی پر کھانے کی سیٹی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر چوچی کے نیچے رکھے ہوئے ٹوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ تو بہ کیا خناس آنکھیں ہیں۔
 ”جانگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی، وہ کیا منہ بناتا ہے۔ اسے سارا منہ کر کرہ ہو جائے گا۔“

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی، لونی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوہتی کے پٹانے جوڑوں کی ماند اداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھجے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے۔ میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھا کر مجھے چاہیے تھا کہ مذاق اڑاؤں، فتقہ لگاؤں کہ
 ”واہ جی واہ دولہا بھائی کھلی کے کباب کھا رہے ہو، مگر جانو کسی نے میرا نہ خرہ دبوچ لیا ہو۔“

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا، اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہے کبخت۔

”راحت بھائی کو فتنے پسند آئے؟“ بی اماں کے سکھانے پر میں نے

پوچھا۔

جواب نہ مارا

”بتائیے نا؟“

”اری ٹھیک سے جا کر پوچھ“ بی اماں نے شہو کا دیا
 ”آپ نے لاکر دیے اور ہم نے کھائے۔ مزید اری ہوں گے۔“
 ”ارے واہ رے جگلی“ بی اماں سے نہ رہا گیا۔
 ”بھقیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔“

”کھلی کے؟“ ”ارے تو رد و کلبے کے ہوتے ہیں۔ میں تو عادی ہو چلا ہوں
 کھلی اور بھونہ کھانے کا۔“

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔ دوسرے روز
 بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لیکر گئی تو بولے۔
 ”کہیئے آج کیا لائی ہیں؟“ ”آج تو ککڑی کے برادے کی باری ہے۔“
 ”کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟“ میں نے جل کر کہا۔
 ”یہ بات نہیں، کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھو سے
 کی ترکاری۔“

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی
 خوراک دیں۔ گھی تپکتے پر اٹھے ٹھسائیں۔ میری بی آپا کو جو شانہ نصیب نہیں اور اسے
 دودھ لمائی بنگلوائیں۔ میں بھٹنا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آگیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر
 ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چوٹھے میں جھکی رہیں، بی اماں چوتھی کے جوڑے
 سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات پھیرنا
 کھانا کھاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی میں کھیا کر

بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف کھدوں کہ کس کی بکری اور کون
 ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے عتھارا یہ میل نہ نامتا جائے گا۔ مگر بی آپا کے مجھ
 ہوئے بالوں پر جو طلعے کی اڑتی ہوئی راکھ.... نہیں..... میرا کلیجہ دھاک سے ہو گیا
 میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیے۔ ناس جائے اس کمبخت نزلہ کا بچا رہی کے
 بال پکے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانہ سے مجھے پکارا۔

”اٹھ، میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پٹ کر دیکھا تو مجھ

جانا ہی پڑا۔

”آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟“ راحت نے پانی کا کٹورہ لے کر میری کلائی پکڑ لی
 میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

”کیا کہہ رہے تھے؟“ بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں
 چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

”کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ۔ جی چاہتا ہے کھانا ہی چلا
 جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں..... اوہ نہیں..... کھا نہیں جاؤں
 بلکہ چوم لوں“ میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھڑو درالہ دی دھنیا کی بسند
 میں سٹرا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے ”یہ ہاتھ“ میں نے سوچا
 جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے
 ہیں، جو تے صاف کرتے ہیں، یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی
 بیگیا رقب ختم ہوگی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے

گا؟ کیا ان میں کبھی ہندی نہ رہے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بے گا؟ جی
جابلہ زور سے چیخ پڑوں۔

”اور کیا کہہ رہے تھے؟“ بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے بہاؤ ذاتی
رسی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو..... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک
بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

اور کہہ رہے تھے ”اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جو شانہ پیا کریں
”پل بھونی“

”ارے واہ بھوٹے ہوں گے آپ کے وہ.....“

”اری چپ مراد“ انھوں نے میرا منہ بند کر دیا

”دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انھیں دے گا۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجو۔“
”نہیں بی آپا۔ انھیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمھاری ان مٹھی بھر ڈیوں کو سوئٹر کی گنتی ضرور
ہے؟“ میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

”آپا بی، تم خود کیا پہنو گی؟“

”ارے مجھے کیا ضرورت ہے۔ چوتھے کے پاس تو ویسے ہی بھلن رہتی ہے۔“

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اڈ پر تان کر کہا:-

”کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟“

”نہیں تو“

”تو بھی ہم نہیں پہنیں گے۔“

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کیونکہ مٹی کے مقودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں

نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبیوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ ان ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جو خفے پیگورے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو مقام لوگدھے کہیں کے اور یہ دوپتہ بڑے سے بڑے طوفان کے پھیسٹروں سے تمھاری زندگی کی ناک کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ تار کی گت نہ بجا سکیں گے۔ سنی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے۔ انھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں، جو لمبے کی آنچ سمیتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھو تے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رہا رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکین ہیں۔ انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھا ما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتا کر تھیں۔ کیسی ڈراؤنی موت کی باتیں بھوک اور کال کی باتیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

”یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔ دیکھئے نا آپ کا کمرہ تا کتنا باریک ہے۔“

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ، ناک، اگر بیان اور بال فورج ڈالے اور اپنی پلنگھی پر جاگری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلی میں ہاتھ دھوئے اور اسٹیل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

”وہ بولے“ ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔“ میں نے سوچا میں آج سب

کچھ بتا دوں گی۔

”کیوں؟“ وہ مسکرائیں۔

”مجھے اچھے نہیں لگتے..... دیکھیے میری ساری چوڑیاں جو رہ ہو گئیں۔“ میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

”بڑے شہر یہ ہیں“ انھوں نے رومانٹک آواز میں شہر مار کر کہا۔

”بی آبا..... سنو بی آبا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔“ میں نے سلگ کر کہا
”آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی۔“

”کیا ہوا؟“ بی اماں نے جارحانہ بھجھکتے ہوئے کہا۔

”دیکھو میری چوڑیاں بی اماں۔“

”راحت نے تو ڈالیں؟“ بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔
”ہاں“

”خوب کیا۔ تو اُسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کا بے کو نکل گیا۔

بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور نگہل گئیں۔“ پھر ہچکار کر بولیں ”خیر تو بھی چوہتی میں بدلہ لئے جو
وہ کسر نکالیں کہ یاد ہی کریں میاں جی۔“ یہ کہہ کر انھوں نے نیت باندھ لی۔

”منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن
دیکھ کر از حد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

”اے ہے تو بڑی ہی شہس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک
میں دم کر دیا کرتے تھے۔“

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے پھیر پھاڑ کے متھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انھوں

نے صرف چھپر چھاڑ کے تیر بہت نسخے سے ان دو میری بہنوں کی شادی کرانی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بیچارے کو لڑکیاں بالیاں چھپر میں، شرمانے لگتے اور شرمانے شرمانے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے۔ اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔ دوسرے دائرے کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھپرنا شروع کر دیتی تھیں۔ کبھی گوریوں میں مرچیں بھر کے بھیج دیں، کبھی سویتوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلو اہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان دالے سے کہا کہ ان کے ہاں شادی کرادو۔ پوچھا کہ ”بھئی کس سے؟“ تو کہا ”کسی سے بھی کرادو“ اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بیجا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سجانا لڑکی۔ ایک اکٹھ پورب تو دوسری بچھم۔ پندرہ تو لے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دوائی۔“ ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تو لے سونا ہوا اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اُسے لگا ملنے کیا دیر لگتی ہے؟“ بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تعالیٰ کا بگین ہوتا ہے۔ جدمر جھکا دو ادھر ہی لڑھک جائے گا۔“

مگر راحت تو بگین نہیں اچھا خاصا پیار ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آنا گوند رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی چھاڑ کر اپنے

کنوارے اپنے کی لعنت سمیت اس میں سما جائیں۔

”کیا میری آپا مرد کی بھوک کی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک اُمنگ بن کر نہیں اُبھرا بلکہ ردنی کپڑے کا سوال بن کر اُبھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھپائی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہوگا“

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے بھوٹے اور نہ ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک کر رکنی اماں نے پیروں کے توڑے گروڑی رکھ کر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی، دوپہر بھر محلہ ٹوٹے کی لڑکیاں صحن میں ادوہم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی سجائی مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چوسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھتی کے جوڑے میں آخری ٹانگے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی نکل جائیں گی۔ آج ان کی بھریوں میں پھر مشعلیں تھکر تھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو پھیر رہی تھیں۔ اور وہ خون کی کچی کھچی بوندوں کو ٹاڈ میں لارہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اُتر تھا۔ تھکے مارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹاتا اور پھر بھج جاتا اشارے سے اُنہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

”اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے“ ان کی بخار سے دکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تذوّر میں جھونکا جلے گا۔ وہ تند ورجو پھ تھینے سے ہمارے خون کے

چھنیٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد برلاے گا۔ میرے کانوں میں ٹانویاں
بجھنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے رات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولہا کے منہ پر لمبا سا
سہرہ پڑا ہے جو گھوڑے کی عیالوں کو چوم رہا ہے.....

چو بھتی کا شہابی جوڑا اپنے بھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ
قدم تو لیتی تھی مگر آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ
کا چہرہ بھول کی طرح کھلا ہوا ہے..... بی آپا کی حیا سے بو بھل نکلا ہیں، ایک بار
اد پر اٹھتی ہیں۔ شکر یے کا ایک افسو ڈھلک کر انشاں کے ذروں میں حقیت کی طرح
الجھ جاتا ہے۔

”یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے“ بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے.....
حمیدہ کا گلا بھر آیا.....

”جاؤ نہ میری بہنو“ بی آپا نے اُسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آئینے
سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

”یہ..... یہ ملیدہ“ اس نے اچھلتے ہوئے۔ دل کو قابو میں رکھتے ہوئے
کہا..... اس کے پیر لہز رہتے جیسے وہ سانپ کی بانہی میں گھس آئی ہو، اور
پھر ہاٹکھسکا..... اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں
بارات کی ٹھنایوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے
مقدم ملیدہ کا فالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا..... نیچے تعفن
اور تاریکی کے اٹھا غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیا ز کے لمبیدے کی رکابی لمبے سے چھوٹ کر لائین کے اوپر گری اور لائین
نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر لنگن میں محلہ کی بہو بیٹیاں
مشکل کشاکی شان میں گیت گارہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت یہاں نوازی کا شکر یہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس
کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی اندھے نہ ملے گئے، پر اسٹے نہ سکے اور سوٹرنہ
بے۔ وق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پھپھے آ رہی تھی ایک ہی جت
میں انھیں دوپہر بیٹھی اور انھوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سر نہ دیا

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بھپائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں
جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا۔ موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تھمل کے
بوجھ سے اُن کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھٹک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان جھریاں بھاٹیں
بھائی کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں انڈھے پھنکار رہے ہوں۔

سٹے کی کان کمال کر انھوں نے چو پر تہ کیا۔ اور ان کے دامن میں ان گنت
قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہر اطمینان تھا جیسے
انھیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوہتی کا یہ جوڑا سینٹا نہ جائے۔
ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چپکے لگیں۔ حمیدہ

ماضی کو دور جھٹاک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر..... سفید گزی کا نشان! اس کی
 سرخی میں نہ جلنے کتنی معصوم دہنوں کا سہاگ چل رہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں
 کے کفن کی سفیدی ڈوب کمر بھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں
 نے آخری ٹانگہ بھر کے دُورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے ردنی جیسے نرم گالوں
 پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ
 نکلیں اور وہ مسکرا دیں۔ جیسے آج انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی بکری کا سوا جوڑا بن کر
 تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بجا اٹھیں گی۔

کدھر جائیں؟

سچ کہا ہے کسی نے کہ دنیا فانی ہے۔ پُرانی قدریں مٹتی ہیں اور نئی جہنم لپیتی ہیں۔ اپنی دنیا کی گائے بھی معلوم ہوتا ہے سیناگ بدل رہی ہے، پرانے قلعے گر رہے ہیں اور نئے تعمیر ہو رہے ہیں۔ بھونچال آ رہے ہیں۔ سربا فلک غارتی زمین بوس ہوئی اُجار رہی ہیں، کچھ ڈمگنا رہی ہیں، کچھ سہارے دھونڈھ رہی ہیں کچھ ملبع کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ ایک تاریکی ہے، اُنچھاؤ ہے جس میں کچھ اندھوں کی طرح ہاتھ پیرا رہے ہیں۔ کچھ ساحل کے کنارے سے لٹکے طوفان کے جھٹکے سے رہے ہیں، یہ دیکھنا ہے کہ ان کے ہاتھ تھک کر ساحل کو چھوڑ دیتے ہیں یا ان کا غم انہیں اس بھنور سے نکال کر پار لے جاتا ہے اس طرف جہاں منزل ہے۔

ایسی حالت میں صرف وہی ادیب کچھ کر سکتے ہیں جو اس طوفان سے تیر کر نکل چکے ہیں۔ اس وقت اکثر ادیبوں کی حالت ایک ایسی کشتی کی سی ہے جیسے دو مختلف پتوار دو مختلف سمتوں کی طرف ٹھیسٹ رہے ہوں۔ خدا جانے کہ اس چھینا چھپی میں بے چاری کشتی کا پیندا نکل جاتا ہے یا نیا پار لگتی ہے۔

اس کشمکش کا نتیجہ تھا جو ساغر نظامی صاحب سے جھڑپ ہو گئی۔ پھر احمد علی صاحب کا مقدمہ ٹھن گیا اور آج جوڑی کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر عبادت بریلوی سے الجھ پڑنے کو جی چاہتا ہے۔ کیا مصیبت ہے۔ کچھ لکھنے لکھانے کے بجائے اکھاڑے ہی میں عمر بیت جائے گی۔ مگر کوئی راہ فرار بھی تو نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تنقیدوں کی صورت دیکھ کر ہی رونگٹے کھڑے ہونے لگتے تھے۔ بڑی بو جھل اور ثقیل معلوم ہوتی تھیں اور پھر ان میں دو چار بول اپنی تعریف میں دیکھ کر ناک سکڑنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ لیکن کچھ دن سے تنقیدیں بڑی کڑوی بنی جا رہی ہیں اور سوائے اس کے کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ کونین کی ان گولیوں کو زبردستی نگلا جائے یا میر یا کوٹا میفائد یا دق میں تبدیل ہونے کی دعوت دے کہ اللہ کو پیلے ہو جائیں۔ مرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

لہذا اب بڑی پابندی سے تنقیدیں پڑھی جاتی ہیں، کسی تفریح طبع کے لئے نہیں، دماغی طاغون سے بچنے کے لئے۔ تنقید نگاروں کو شاید احساس نہیں کہ ہماری لگام میں انھیں کے ہاتھ میں ہیں اور کتنے ہی اڑیل ہوں آہستہ آہستہ قابو میں آہی جاتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ کچھ ہنر بازی کے قائل ہوتے ہیں اور باتوں سے نہیں مانتے۔ بہت کم ایسے ہیں جو آزاد کھپروں کی طرح قلائیں بھر جاتے ہیں۔

لیکن عبادت صاحب کا تازہ عنوان نقوش میں پڑھ کر میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا فیصلہ کروں۔ جی میں آتا ہے قلا پخ بھر جاؤں۔ پھر سوچتی ہوں ایک بار اور پوچھ لوں کہ میں کیا سمجھوں! سب سے پہلے تو وہ براہ کرم اپنے اس

پیراگراف کے معنی سمجھائیں :-

"انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہونے کے لئے کبھی بھی کمیونسٹ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج بھی نہیں ہے۔ آئندہ بھی نہیں ہوگی۔ اس میں ہر سیاسی خیال کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں، البتہ اس میں شریک ہونے کے لئے چند بنیادی باتوں پر ان کا متفق ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ انسانیت کی قدروں کو آگے بڑھانے میں مدد کریں گے۔ جبر و استبداد کی مخالفت ان کا فرض ہوگا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے سماجی زندگی میں جو افراط فزی مچا رکھی ہے۔ جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے اس کو فنا کرنا ان کے نزدیک از بس ضروری ہے۔ آزادی تحریر و تقریر ان کے نزدیک انسان کا بنیادی حق ہے اگر ایسا نہ ہو تو انھیں اس کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اگر حکومت اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لئے ادب اور تہذیب، کلچر اور سماج کی چھاتی پر مونگا دیتی ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ ایسی حکومت کی مخالفت کریں۔ دنیا میں جو سرمایہ دارانہ قوتیں اپنے جال پھیلا کر غوامی اور انسان دوست طاقتوں کو اسیر کرنا چاہتی ہیں، ان کے خلاف آواز اٹھانی ترقی پسند ادیبوں کے نزدیک لازمی ہے۔ وہ اپنے ملک میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے مظاہرے نہیں چاہتے۔ وہ صحیح

منزل میں عوام کی حکومت کے خواہاں ہیں۔ عوام کی زندگی کو بلند کرنا ان کے پیش نظر ہے، ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کاٹ پیچ کی باتوں کو پوری طرح سمجھ سکیں بحالات کا صحیح جائزہ لے سکیں اور عوام کے نقطہ نظر کی ترجمانی ان کے حق کا حصہ بن سکے۔ اگر ان بنیادی باتوں سے کوئی ادیب اتفاق رکھتا ہے تو وہ ترقی پسند ہے، وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا ممبر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے سیاسی جماعت سے وابستہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ فروعی باتوں میں اختلافات کے باوجود مختلف ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہو سکتے ہیں، لیکن ان بنیادی باتوں پر ان سب کا متفق ہونا ضروری ہے جن کا بیان اوپر کیا چکا ہے۔

معاف کیجئے گا جناب کلمہ تو بڑھاتے ہیں پھر کہتے ہیں مسلمان نہ ہو سب کچھ تو وہی کہا ہے جو کمیونسٹ کہتے ہیں مگر پھر کہہ دیا کہ کمیونسٹ ہونا ضروری نہیں۔ اس "مگر" کی تک بندیوں سے تو ہم عاجز آچکے ہیں۔ یہ کمبخت لفظ تنقید نگاروں کو ایسا بھاگیا ہے کہ لگے ہاتھوں اس کا پھندا مار ہی جاتے ہیں قبلہ یہ تو بتلیئے کہ سمندر میں کود پڑنے کے بعد وہ کون سی برساتی پوشاک پہنی جائے جو خشاک رہ جائے۔

خود ہی تو کہتے ہیں کہ

"میں اشتراکیت کو موجودہ سیاسی کشمکش کا واحد حل سمجھتا ہوں"

مگر ان کو اشتراکیت کے بعض اصولوں سے اختلاف بھی ہے۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ ایک دفعہ جی کر اکر کے ان اختلافات کو واضح کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ ویسے تو رومنین اور ایٹلی بھی اشتراکیت کے امر کی روکے قائل ہیں۔ ہمارے پنڈت جی کو بھی بس تھوڑے ہی اختلافات ہیں۔ ساگر نظامی اور احمد عباس صاحبان بھی اس مسئلے کے نتیجے یہی فرماتے ہیں مگر اختلاف کے ساتھ۔ تو پھر وہ کیا بات ہے جسے لیکر آپ لوگ چھپا بیٹھے ہیں اور ہم بچاڑوں کو نہیں بتاتے، آخر وہ کون سے اختلافات ہیں ہمیں بھی مطلع کیجئے تاکہ اگر کہیں غلطی ہے ان سے واقف نہ ہوئے ہوں تو اب ہو جائیں۔ ادیبوں کی جان پر بڑا احسان ہو گا ان "اگر" "مگر" "گول" "بول" جملوں سے ہمارے دلوں میں بڑی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔

عبادت صاحب کے میری استدعا ہے کہ برائے کرم بڑا نہ مانئے گا جیسے ہم نے آپ کی تنقیدوں کو سرانگھوں پر لیا ہے۔ آپ بھی ہماری بات ٹھنڈے دل سے سننے کے لئے تیار ہو جائیے۔ کہیں یہ نہ سوچئے لگئے گا کہ یہ تنقید آپ پر کمیونسٹوں پر اعتراض کرنے کی وجہ سے کی جا رہی ہے۔ لوگ اچل بڑی جلدی بگڑ کھڑے ہوتے ہیں۔ کیا عبادت صاحب بتا سکتے ہیں کہ انھیں اور بہت سے دوسرے ادیبوں کو بانگ دہل یہ یقین دلانے کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے کہ ترقی پسند مصنفین سب کے سب کمیونسٹ نہیں۔ اور وہ خود بھی کمیونسٹ نہیں۔ کمیونسٹ ہونا ضروری نہیں۔ آخر کیوں؟ میں کہتی ہوں کہ نہ ہونا بھی تو ضروری نہیں۔ آپ لوگ اس بات پر کیوں زور نہیں دیتے کہ اگر کوئی ترقی پسند

مصنف کمیونسٹ ہے تو کوئی ہرج نہیں۔ میرے دل میں شہمہ ہوتا ہے، اور خدا را اسے دور کیجئے میں سوچتی ہوں کہ وہ کسی سے ڈر کر ایسا کہہ رہے ہیں اور کمیونسٹوں کے خلاف ایک بات کی بھی تشریح نہیں کرتے۔ ایک اختلاف کو بھی واضح نہیں کرتے۔ آخر کیوں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کچھ لوگ انجمن سے بھاگنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ آپ انھیں دلاسا دے رہے ہیں۔ وہ بدک رہے ہیں۔ آپ انھیں چمکا رہے ہیں، وہ ڈر رہے ہیں۔ آپ انھیں ثبوت دے رہے ہیں کہ "ڈرو نہیں کوئی ہوا" محققین نہیں کھا جائے گا۔ آخر کمیونسٹوں کو یہ یقین دلانے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس ہوتی کہ انجمن میں رجعت پسند نہیں اور جو ہیں وہ محققین کا میٹنگے نہیں۔

عبادت صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ بڑے بڑے مختلف زبانوں کے ادیب ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے بدکتے ہیں۔ اگر ان کا ڈر نہ نکالا گیا تو وہ ہمیشہ بھجکتے رہیں گے۔ میرے خیال میں تو ان باتوں سے لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا خدشہ کبھی نہ مٹے گا کیونکہ ان کا خیال ہے کہ انجمن میں زیادہ با اثر کمیونسٹ ہیں یا وہ جو صحیح معنی میں اشتراکیت پر ایمان رکھتے ہیں، مگر چند اختلافات کا فاصلہ ہے اب یہ فاصلہ جانے کب دور ہو جائے اور انجمن کھلے بندوں اشتراکیوں کی ہو جائے۔ اشتراکی ہونا آجکل جرم ہے ان کی طرح سوچنا بھی جرم ہو چکا ہے۔ اختلافات کی آڑ زیادہ دن نہ چل سکے گی، رہ گئی انسان دوستی کی ٹیٹی یہ بھی کتنے دنوں کی۔ جب تک بند ڈبہ ہے کام چلتا ہے جس دن کسی نے انسان دوستی کی تشریح کا سوال اٹھا دیا پول کھل جائے گا، پھر کیا کریں گے؟

اب ایسے خیالات میں اُبھھے ہوئے لوگوں کو کب تک رستی سے باز رکھیں
 کہ انجمن میں رکھا جائے گا۔ ایسی حالت میں جبکہ ترقی پسندوں کا پروگرام اشتراکیوں
 سے دن بہ دن اتنا قریب آتا جا رہا ہے، یہ کہہ دینے سے کام نہ چلے گا کہ "ہم
 ترقی پسند ہیں" "انسان دوست ہیں" "عوام کے ساتھی ہیں" "سرمایہ داری
 کے دشمن ہیں" "انقلاب کے علمبردار ہیں" "اشتراکیت کو سیاسی مشکلات کا
 واحد حل سمجھتے ہیں"..... "مگر ہم تو" خالص ادیب ہیں" اور کچھ
 نہیں۔

بھلا حکومت اور اس کی مشینری ان حکیموں میں آنے والی رقم سے
 وہ خوب سمجھتے ہیں کہ عوام کے دوست انسانیت کے حامی جاہے کچھ بھی ہوں انکے
 دشمن ہیں تو پھر کیا فائدہ لگی لپیٹے کہنے سے، اور لگی لپیٹ رہے گی بھی کتنے دن؟
 تار تار تو ہوئی جا رہی ہے، اس قسم کے تنقیدی نعرے لکھنے والوں کو کتنا گر بڑاتے
 ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کیوں کہا جا رہا ہے۔

عبادت صاحب کا یہ کہنا بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ترقی پسند انجمن
 میں ہر سیاسی پارٹی کے لوگ رہ سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ خواہ وہ لیگی ہوں یا
 مہاسبھائی۔ نیشنل گارڈ ہوں یا آر۔ ایس۔ ایس۔ والے اور فاشسٹ، بکے
 لئے انجمن کی آغوش کھلی ہوئی ہے۔ مگر یہ ہو کیسے سکتا۔ ایک شخص بیمار بھی ہو اور
 تندرست بھی۔ بھوٹا بھی ہو اور سچا بھی۔ الٹا بھی ہو اور سیدھا بھی ہو۔ آپ لاکھ
 بلائیں "ہر سیاسی پارٹی" کا فرد جس کا پروگرام جدا ہے۔ وہ انجمن میں آنے
 ہی کیوں لگا۔ اگر انجمن میں لیگی اور کانگریسی سرکار کے گن نہ گائے جائیں تو اس

پارٹی کے لوگ کیوں جھاک مارنے آئیں گے۔ فاشزم کے قصیدے نہ پڑھے
 جائیں تو اس انجمن سے کیا دلچسپی؟ آپ بے کار انھیں یقین دلارہے ہیں کہ انجمن
 میں کمیونسٹ نہیں، وہ کمیونسٹوں سے نہیں ان قدروں سے ڈرتے ہیں جو ان
 کا سرمایہ ہیں۔ آج وہ کمیونسٹ کا بہانہ کر کے انجمن سے بھاگ رہے ہیں، کل وہ
 صاف صاف کہہ دیں گے کہ ”بھئی یہاں تو فاشسٹوں کے گن نہیں گائے
 جاتے۔ کانگریس اور لیگی سرکار کے شکرے نہیں ادا کئے جاتے، ٹاٹا اور برلا
 کے مرثیے اور سہرے نہیں گائے جاتے ہم یہاں نہ آسکیں گے“ پھر جناب
 انھیں کونسا بھلا دے دیں گے۔ کیا پھر ان قدروں اور اصولوں کو بھی ترک کرنے
 کا مشورہ دیں گے جن سے انھیں اختلاف ہے، اور جو انجمن کا ورثہ ہیں؟

رہ گیا نئی انجمن قائم کرنے کا سوال، تو اس کے قائم کرنے کے لئے ہم کو
 بہت نیچے گرنا پڑے گا۔ وہ تو قائم ہو کر رہے گی، کیونکہ اسے سرکاری مدد ملے گی
 اسکا انجام بھلے وہ ہو جس کی آپ نے پیشین گوئی کی ہے۔ اب ہمارے مفید نگار دین
 کو سچائی کے اظہار سے صاف کرنے کے بجائے اور دھندلا رہے ہیں۔ ادھر ہمیں
 بوکھلائے دے رہے ہیں اس ”غیر جانب داری“ سے اب کام نہ چلے گا۔ یہ سمجھوتے
 اب نہ ہو سکیں گے مجھے تو کچھ خدشہ ہوتا جا رہا ہے کہ ہمیں خدا نہ کرے عبادت
 صاحب بھی آہستہ آہستہ ”انسان پارٹی“ میں نہ کھسک جائیں۔

آگے چل کر عبادت صاحب کہتے ہیں ”ایک ترقی پسند ادیب کی
 اشتراکیت ایک اشتراکی کارکن کی اشتراکیت سے مختلف ہے۔ یہ ادبی اشتراکیت کس
 چڑیا کا نام ہے۔ میں نے آج سے پہلے نہیں سنا تھا۔ براہ کرم تشریح کیجئے۔ میں نے

تو آج تک کسی کتاب میں اس قسم کی اشتراکیت کے بارے میں نہ ہی پڑھا ہے نہ ہی کسی سے سنا۔ اشتراکیت تو وہی ہے جس پر اشتراکی عمل کرتے ہیں۔ براہ کرم عبادت صاحب یہ بھی بتائیں کہ سیاست گندی چیز کیوں ہے؟ برا نہ مانے، گلے صاف گوئی کا مرض ہے۔ کسی زمانے میں ہمارے سفید آقا طالب علموں سے یہی کہا کرتے تھے کہ "سیاست سے دور رہنا چاہیے" مگر اس وقت ہمارے کانگریسی رہنما کہا کرتے تھے "سیاست تمہاری زندگی ہے اور زندگی سے تو دور نہیں بھاگ سکتے" قدرت کے کھیل دیکھیے آج وہی رہنما کہتے ہیں "سیاست سے دور رہو" یہ ہمارے مطلب کی چیز نہیں! آج عبادت صاحب بھی انہیں کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ جب ہم میں سے کوئی اپنا سا بھتی اٹھ کر ایک سیاہ قلب سیاہ کار گر وہ کا قول دہرا دیتا ہے تو خون کھول جاتا ہے اور بڑی گھن آتی ہے۔ پرانے لٹا بھی تو کہتے تھے۔

"قرآن شریف عوام کے سمجھنے کے لئے نہیں ہے"

اور پنڈت بھی دعویٰ کرتے تھے :-

"وید کے ٹھیکے دار صرف برہمن ہیں"

کس مزے سے عوام کو غچہ دے کر ان کتابوں کو مطلب پرستی اور کاروبار کے لئے استعمال کیا گیا، آج ہمارے رہنما اور حکام اور ان کے ہمنوا بھی یہ ہی جانتے ہیں کہ ہم سیاست کو گندہ سمجھ کر روح اور جسم کے تانے بانے میں پھنس جائیں۔ عبادت صاحب یا تو اس بات کا مفصل جواب دیں ورنہ مجھے ان کو بھی اس ہی صفت میں بٹھا دینا پڑے گا۔ کم سے کم وہ اس بات کا اعتراف کریں اور بتائیں کہ وہ

کون سی طاقت ہے جو اُن سے یہ سب کچھ کہلوا رہی ہے۔ علی عباس حسینی اور جواد زیدی کو تو وہ اعلائیہ ہمارے دشمن بتا رہے ہیں اس کا شکر یہ! ہم چوکنے ہو چکے ہیں مگر وہ خود تو ہمارے درمیان ہیں۔ کیا اب ہمیں ان کے الفاظ بھی ناپ تول کر پرکھنے ہوں گے۔ علی عباس حسینی اور جواد زیدی سے دو ہی قدم پیچھے تو وہ خود نظر آ رہے ہیں۔

بات صاحب کیا ہمیں احمق سمجھتے ہیں؟ کیا ہم سیاست کے معنی بھی نہیں سمجھتے۔ ریاست میں غرق ہونے کے لئے یہ لازمی تو نہیں کہ نعرے لگائے جائیں، جھنڈے اٹھائے جائیں اور ٹریڈ یونین کا ممبر بنا جائے۔ قلم میں طاقت ہے تو بغیر سڑک پر جائے اسٹرائک کروا سکتے ہیں۔ ریلوں کے تو کیا حکومت کے پیہ کو جام کر سکتے ہیں۔ لیکن فرق ہی کیا ہوا۔ ریل کا پیہ جا بے تحریر سے جام ہوا یا ہاتھ کے کسی رگ و پھٹوں سے۔ بات تو دہری ہوئی۔ اس میں اتنے داؤں بیج دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ بہر حال ناک تو پکڑنا ہی ہے مگر بغیر ہاتھ کی مدد کے ہم صرف تحریر سے کیا کر سکتے ہیں۔ ہمارے قومی ارادے عمل کرنے والے ہاتھ کے محتاج رہیں گے، لیکن ان کی تحریر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسٹرائک کرنے والوں اور پیہ جام کرنے والوں اور ٹریڈ یونین کے ممبروں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہاں ممبئی میں اور دوسرے مقامات پر انجمنوں میں بہت سے ادیب ٹریڈ یونین کے ممبر بھی ہیں۔ ریلوے میں کام کرتے ہیں۔ اسٹرائک بھی کرتے ہیں۔ کیا عبادت صاحب کی رائے میں وہ ادیب جو خارجی حالات سے اثر لے کر اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں کچھ ان سے بالاتر ہیں۔ نہیں مبرا یقیناً

کہ وہ جو عملی کام انجام دے رہے ہیں وہ انقلاب کا ہر اول دستہ ہیں۔ ہم خارجی قسم کے ادیب تو ان کے پیچھے پیچھے جملہ ساز و سامان حرب کی مانند ہیں، ہم تو صرف ان کے فوٹو گرافر اور ایک حد تک راستہ صاف کرنے والوں میں سے ہیں۔ ہم ان سے بہت پیچھے اور بہت نیچے ہیں اور ہمارا مقام کسی بھی کلی ٹھنڈے اور لفظی سے ان سے بلند نہ ہو سکے گا۔ صرف کھوکھلی خود ستائی کے علاوہ اس میں اور کچھ نہیں۔

مگر عبادت صاحب توجیہ کرتے ہیں۔ غل کو نیچے گرنے کے معنی دیتے ہیں اور تخریری تخلیقوں کا نام جہام اٹھا کر چلتے ہیں جو بغیر کسی قسم کا عملی حصے لے الگ تھلاک ایک قہر میں بیٹھ کر ظہور میں لائی جاتی ہیں جو کچھ میں نے رام بلاس شرم سے سمجھا تھا وہ سب کچھ گڈ گڈ ہو کر رہ گیا۔ اب مجھے غصہ نہ آئے تو کیا ہو۔ عبادت صاحب ادیب کو ایک عام فرد سمجھتے ہوئے ہتک محسوس کرتے ہیں اسے عجوبہ بنا کر بلندی پر چرخ میلی قام پرستاروں سے بھی آگے آسمانوں سے بھی اونچا "لٹکائے دیر ہے ہیں۔ بخدا یہ آسمانوں سے اوپر خالی فضا کے تصور سے ہی دم گھٹنے لگتا ہے۔ ویسے بھی بیچارے ادیب کو یوں الٹا ٹنگنے سے کیا فائدہ۔ پھر وہ زندگی کا مطالعہ کیسے بجا لائے گا۔ "انسان دوستی" اور "عوام کی بہتری کے جملہ فرائض اتنی دور سے کیسے بجالائے گا کہیں موصوف بیچارے کو چھوٹا موٹا پیغمبر تو نہیں سمجھ رہے ہیں جو وحی کے ذریعے اس پر چودہ طبق روشن ہو جایا کریں گے۔ براہ کرم، یہ احمقانہ دم ادیبوں کے دل میں نہ ٹھونسے۔ بڑی مشکل سے تو وہ خود کو انسان سمجھنے پر تیار ہو پائے ہیں، آپ انہیں پھر معلق کئے دے رہے ہیں۔ میرا مطالعہ اور تجربہ تو کہتا ہے کہ ادیب بالکل ہو ہو انسان ہوتا ہے اسکے بوی بچے، میاں۔ ساس سسر، منہ بھابھ

دوست دشمن تو فیصدی ٹھوس ہوتے ہیں اسے باقاعدہ اپنی رونی
کی فکر کرنی پڑتی ہے اور یہ فکر اسے بار بار اس ہی میدان کی طرف گھسیٹ لیجاتی
ہے جس کا نام سیاست ہے جو بقول آپ کے گندی ہے جسے وہ دھوپ بچھکر صاف کرنا
چاہتا ہے۔ وہ کتنا ہی چاہے تو بھی اس سے دور بھاگ کر زندہ نہیں رہ سکتا
تو پھر ادب کی تخلیق کیسے کر سکے گا۔ "دال کا دانہ" لینے کے لئے اسے خواہ وہ کتنے
ہی اونچے آسمان پر ہو کر نیچے آنا ہی پڑتا ہے۔ خدا بھلا کرے بیکاری اور تنگدانی کے محارم
کا۔ وہ بقول آپ کے اور بھی "نیچے" پھسلتا آ رہا ہے۔

میں ایک ادیب کو جانتی ہوں جسے اپنی تصانیف کے مواد کی خاطر چھروں
میں جانا پڑتا ہے۔ اس کا کشمیر کے مرغزاروں میں طرارے بھرنے کا عادی دماغ
سوکھی مچھلی کی بدبو سے مانوس ہو چکا ہے۔ وہ گندی چالوں، سڑتے محلوں میں
جاتا ہے، کبھی ٹرام یا مچھلی والیوں سے بھری ہوئی بس میں کبھی پیدل زمین ناپتا
ہوا اس کا گھر قطعی نشیب میں ہے جہاں وہ سیلے مکروں میں ننگے بچے گود میں لئے
ادب کی تخلیق کیا کرتا ہے۔ وہ بہت بلند پایہ ادیب ہے۔ اس میدان میں چوٹی پر
کھڑا ہوا ہے۔ کوئی کتنی ہی کوشش کرے وہ اپنی پست جگہ چھوڑنے پر راضی نہ
ہوگا۔ بات یہ ہے کہ عبادت صاحب کو پتہ نہیں کہ دنیا اونڈھی ہوگی، اب آسمان
نیچے اور زمین اوپر ہے۔

دیسے موصوف کی رائے کیا ہے؟ کیا ہم لوگ ناک پر رومال رکھ کر خارجی
زندگی جا کر دیکھ آئیں اور تنہا کے بل بوتے پر ادب پیدا کرنا شروع کر دیں۔ انکو
تجربہ نہیں۔ لاشعور اور نفسیات کے بارے میں تو اس طرح مطالعہ کر کے لکھا جاسکتا

ہے۔ خارجی مطالعہ کر کے جو ادب بھی شکر کوٹنے والی۔ چرواہی اور مزدوری کے بارے میں پیدا ہوا ہے اس سے ہم عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ موصوف اسے پیدا ہونا کہہ لیں میں تو اسے اسقاط ہی سمجھوں گی اور وہ بھی پھوڑ یا کا اس ادب میں شروع سے لیکر آخر تک پڑھنے کے بعد مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محنت کش طبقہ کی تضحیک کی گئی ہے۔ اس سے وہی کام لیا گیا ہے جو ویشیا سے لیا جاتا رہا ہے۔ مزدوری کے بھیس میں بھی وہی اندر سمجھا کی پری جھلکتی نظر آتی ہے کبھی کبھی محتاط ہو کر اسے چھینٹوں اور غلاظت میں لپیٹنے کی کوشش کی گئی ہے مگر وہاں بھی چولی انگیا کے آگے کچھ نہیں بدلا۔

کیا عبادت صاحب یہ نہیں مانتے کہ اگر ہم عوامی ادب پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں عوام سے قریب ہونا پڑے گا اگر نہیں تو براہ کرم تشریح کریں کیونکہ ہم تو اس ہی غلط فہمی "میں مبتلا ہیں لیکن اگر عوام کے قریب جانے کی اجازت دیتے ہیں تو یہ بھی بتائیں کہ مندرجہ ذیل موقع پر حکمائے ادب کون نسخہ استعمال کرنے کی ہدایت دیتے ہیں۔ ہم عوام کا مطالعہ کرنے جاتے ہیں اور وہاں کوئی اسٹریک چل رہا ہے یا کوئی جلسہ ہو رہا ہے۔ اب ہم تو وہاں مرنے سے مطالعہ کر رہے ہیں کہ لاکھٹی اور گولی آن دھمکی اس وقت کیا سر پر پر رکھ کر بھاگ نکلتا چاہے؟ چلے یہ بھی سہی اور جو عین وقت پر گر پڑے اور پکڑے گئے تو کیا کریں گے۔ بھلا کون یہ عذر مانے گا کہ ہم وہاں مطالعہ کی غرض سے آئے تھے۔ ثبوت ہی کیا دینگے؟ اور کیا ہم یہ ثبوت دینا پسند بھی کریں گے؟ کہ ہم عوام میں سے نہیں ہم تو آسمانی مخلوق ہیں چیز مصلحت وقت سمجھ کر یہ بھی جھیل گئے لیکن اگر احتساب کریں تو ان لوگوں

نے کہا کہ ”یہاں کیا جھاک مار رہے ہو۔ سرکاری حلقوں میں ایک سے ایک عظیم الشان ڈیز چل رہے دہاں جا کر کیوں نہیں مطالعہ کرتے“ پتہ ہے اگر اسکا جواب صاف صاف دے دیا تو کیا حشر ہوگا۔ فوراً آپ کمیونسٹ بن جائیں گے۔

ڈاکٹر علیم نے بھی کانفرنس کے موقع پر ممبئی میں یہ ہی کہا تھا کہ ”وہ ادیب جو قلم چھوڑ کر تلوار اٹھاتا ہے ادب کے غداری کرتا ہے“ قبلہ عالم یہاں کسے کمبخت تلوار اٹھانے کا شوق ہے، مگر اپنے سر پر گرنے والی تلوار بھی تو دشمن کے ہاتھ سے ہم ہی کو پھین فی ہے۔ اگر ہم پر لاشی اور گولی برسے تو کیا ہم چپ چاپ سینہ تانے کھڑے رہیں؟ بتائیے نا آخر کیا کریں؟ مجھے پتہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے کیا جواب دیا تھا کیونکہ میں میناگ میں دیر سے پہنچی تھی۔ اب عبادت صاحب ہی براہ کرم بتا دیں کوئی تیر بہ حد نسخہ جو وقت پرٹنے پر تلوار کے خلاف استعمال کیا جاسکے۔

عبادت صاحب کی اس تنقید سے ان لوگوں کے دل پر کیا اثر ہوا ہوگا جو مورچوں پر لڑ رہے ہیں جو حکومت کے مہکلنڈوں کا پیہیہ جام کئے دے رہے ہیں جو دالہ کے پہاڑ ڈھائے دے رہے ہیں اور فاشزم کے بیج بکھینی کر رہے ہیں یا ان لوگوں سے انکا اور ترقی پسند مصنفین کا کوئی ناتہ نہیں۔ اگر نہیں تو پھر کھلے بندوں اعلان کیجئے۔ اب نعرے بازی کا وقت نہیں اب ہمیں ہر نعرے کی تشریح بھی کرنا ہوگی اپنے ہر قدم اور فعل کا حساب دینا ہوگا، ایک دوسرے سے اگر سوال مانگا جائے تو اسے الزام لگانا ذاتی پر خاش کی بنا پر حملہ کرنا یا پارٹی

بندی کی پالیسی کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا برا ماننے سے بھی کام نہ چلے گا۔ دلائل سے قائل کرنا پڑے گا ورنہ صاف کہہ دیجئے۔

”ابھی فضا سازگار نہیں ذرا آہستہ چلو راستے میں روٹے ہیں۔“
مگر ساتھ ساتھ یہ بھی کھٹے گا کہ کس سال کس مہینے کس دن اور کون سی گھڑی فضا سازگار ہو جائے گی۔ یہ روٹے آپسے آپ راستے سے کھسک جائیں گے کہ انقلاب مزے مزے ٹھٹھا ہوا چلا آئے گا اور اس مبارک گھڑی کے انتظار میں اتنے دن ہم آسمانوں سے بلند چرخ بینی سے بھی آگے ایون کا انٹانگل کرتا رہے گئے رہیں کہ کچھ اور بھی کریں۔

لیکن اگر عبادت صاحب کی رائے ہے کہ بھٹی ذرا گول مول پروگرام رکھو۔ تھوڑی لگی لپیٹ کہو کہ ادیب برائے نام جائیں تو جناب مجھے ان برا ماننے والوں سے بڑی نفرت ہے۔ میری اماں سمجھایا کرتی تھیں ”لو کیوں کو بڑی بوڑھیوں کے سامنے پٹا پٹ نہ بولنا چاہیے نہیں تو کوئی نہ قبولے گا۔ سدا کنواری بیٹھی رہیں گی۔“ کنوارے مرجانا منظور بڑی بوڑھیوں کے خزانے بس کی بات نہیں جو کوئی بھی انجمن میں شریک ہونے کے لئے شرطیں لگاتا ہے اسے ان شرطوں کا محاسبہ دینا ہوگا۔ اگر ان کی شرطیں احمقانہ ہوں گی تو ان کا پورا کرنا انجمن کا کام نہیں۔ آج ایک بہانہ کرتے ہیں کل سو بہانے کریں گے انجمن کب تک ان کے خزانے سے لے گی اور کیوں؟ کیا مستقبل سے ہم اتنے ناامید ہو چکے ہیں؟ کیا ادب یا بچہ ہو جائے گا؟ اور نئے ادیب پیدا ہی نہ ہوں گے۔ جو ہم موجودہ ادیبوں کی خاطر انجمن کے منشور کو توڑ مروڑ کر نئی نئی پھلجھڑیاں لگائیں۔ ہمارے آج کے فیصلوں

سے ہمارے ادب کا مستقبل وابستہ ہے۔ اسی پر ہماری آئندہ پالیسی کا انحصار ہے۔ اگر ہم نے فراخ دلی سے ان اکھنوں اور غلط فہمیوں کو نہ سلجھایا تو آئندہ ہمیں عجیب عجیب پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہمارے نظریات جب تک واضح نہ ہوں ہماری تحریریں بھی جب تک گول مول رہیں گی اور ابھرنے والے نئے ادیب ان غلط فہمیوں کا شکار بن کر ادب کی صورت کو اور بھی مسخ کر دیں گے۔ یہ مسئلہ اتنا سظمی نہیں جتنا عبادت صاحب کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے جس کی روشنی میں اکھن کے نئے منشور کا حلیہ ایسا بگڑ جاتا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ یوں تو ہم چاہیں تو ہر کام کو انتہا پسندی "اور قبل از وقت" کا روڑا اٹھا کر روک سکتے ہیں مگر ہمارا مقصد روڑے اٹھانا نہیں۔ راستہ کو صاف کرنا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آج جسے "انتہا پسندی" کہا جا رہا ہے، کہیں ہمارا پروگرام ہی نہ ہو اس لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے پروگرام کا تعین کرنا ہوگا ورنہ ڈر ہے کہ ہم بہک کر کسی اور سمت چل پڑیں گے۔ نہ جانے کس طرف !

کیڈل کورٹ

کچے چمڑے کی مختصر سی گڈی 'کچھ رنگہیاں' کیلیں اور نعل، ایک آدمہ
 ہتھوڑی رانپی، سوا اور چند کبسوے۔ یہ ہے اس کا سارا اثاثہ۔ اس کے علاوہ
 چند پھٹے، اُدھرے جوتے، ایک اُلجھی ہوئی گڈی رد چارٹن کے ڈبے۔ یہ ہے
 اس کا گھر جس کا بھٹاک ڈاک کا پتہ ہے۔ کیڈل کورٹ کی موری سے ذرا بائیں طرف
 کو ایرانی ہوٹل کے سامان کے نیچے جہاں اوپر سے پھینکے ہوئے کچرے اور پان
 کی پکیوں سے پوری طرح محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ اس کا مکان، گھر، محل، حویلی جو
 بھی سمجھ دیجئے واقع ہے، یہی اس کا وطن ہے اور وہ یہیں کا باشندہ۔ نہ جانے کب
 سے رہتا ہے، اور کب تک رہے۔ اندازہ تو یہی کہتا ہے کہ صاحب لوگوں کے
 جوتوں پر بالٹ کر تے کرتے اسے اس نفع بخش پیشہ کو اختیار کرنے کا خیال آیا، ہوگا
 اور یہ خیال جب تک آتا رہے گا جب تک کہ ایک دن اسی جگہ مجبوراً اس کی روح
 اس کے کرا دے کیلے جسم سے دق ہو کر بھاگ نہ کھڑی ہوگی اور پھر جب وہ حسب
 معمول گودڑ میں سے جہاں وہ روز سوچ کے ساتھ ساتھ چھپ جاتا ہے، نکل کر

پرانے جوتوں کی قطار لگا کر خام چمڑی کی گڈی نہ کھولے گا تو وہ راہ گروں کی
 کھڑکروں سے بھی نہ جاگے گا اور ناک پر کھڑا ہوا سپاہی اپنا فرض انجام دیتا ہے گا
 سڑک پر موٹریں دوڑتی رہیں گی۔ ہوٹل میں پیالیاں کھنکھتی رہیں گی اور ساری جیتی
 جاگتی فضا میں وہ سویا پڑا رہے گا۔

پھر جب اس کی میند کا بھرم کھلے گا تو کیڈل کو رستے کے باسی اور ہوٹل میں
 آنے جلنے والے چہ میگوئیاں شروع کر دیں گے۔ کتے اس کے سر و جسم کو سونگھیں
 گے اور کھیاں بھنبھنائیں گی۔ سرکاری لاری آئے گی اور بحیثیت ایک شہری کے
 اسے اس کا حق سونپ دے گی۔ نہ جانے وہ وقت کب آئے گا۔ فی الحال تو وہ
 ہوٹل کھلتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ اینٹوں کا مضحکہ خیز درجہ سنا کر اسپر اوولٹین کے
 خالی ڈبے میں پانی چڑھا دیتا ہے۔ ہوٹل کے پاس رہتے ہیں اسے کتے ہی فائدہ
 ہیں۔ علاوہ بزنس کی فراوانی کے عمدہ کھانوں کی لذیذ خوشبو مفت ہاتھ آتی ہے
 اُبلتی ہوئی چائے کی پتیوں کو بوری پر روزانہ حفاظت سے اگر سکھایا جائے تو بائوڑ
 چائے تیار کی جاسکتی ہے۔ گو یہ پتیاں اُبالنے کے بعد میلنے پر ذرا سا ہی رنگ
 چھوڑتی ہیں کیونکہ ہوٹل والا خود ان کا پہلے ہی کسی کسی بارخون پخوڑ لیتا ہے جب
 پھینکتا ہے۔ گرم گرم میلا پانی پی کر وہ اطمینان سے اپنی دوکان سجانے میں
 مشغول ہو جاتا ہے۔ شاید فوڑٹ کی دکانوں کے بڑے بڑے مالک بھی اتنا وقت
 سجانے میں نہیں صرف کرتے ہوں گے۔ وہ بڑی احتیاط سے کپے چمڑے کی گڈی
 کھولتا ہے۔ ایک ایک ٹکڑے کو جانچتا پڑتا ہے۔ پتہ نہیں وہ اپنی چمڑی آنکھوں
 سے اُن ٹکڑوں پر کیا گھورا کرتا ہے۔ پھر سر ہلا کر آنکھیں درجہ بدرجہ ترتیب دیتا

جاتا ہے۔ پھر وہ زنگہیا کی کیلیوں کی ڈبیاں اور شیشیاں نکال کر دواؤں کی طرح
 سجاتا ہے۔ نعل اور چکیلی کیلیں بڑے حساب سے بچھاتا ہے۔ پھر پرانے جوتوں کی
 نظار لگانا شروع کر دیتا ہے۔ اس سجادہ میں وہ برابر دواؤں کے دے جاتا ہے حتیٰ
 کہ کوئی گاہک آکر اسے چونکا نہ دے۔ اسی صورت پیدا ہوتے ہی وہ نہایت پھرتی
 سے جوتے کی نمبھ دیکھ کر نسخہ تجویز کر دیتا ہے۔ پھر مزے لے لیکر ایک ماہر فن حراج
 کی طرح وہ اس کا ایک ایک جوڑا مٹھو ناک بجا کر دیکھ لیتا ہے جیسے اسے عشق ہو ان
 جوتوں سے۔ ہاتھ میں لیتے ہی پہلے تو وہ بڑے پیار سے اسے اُلٹا پلٹتا ہے پھر
 گاہک کی طرف دیکھتا ہے گویا پوچھتا ہے۔ اب لائے ہو بیچارے کو، اب اس میں جان
 کہاں، خیر دیکھتا ہوں۔ خدا پر بھروسہ رکھو اور پھر اوزار چل پڑتے ہیں۔ چھٹاپٹ سوا
 چمڑے میں ڈبکیاں مارتا ہے، زنگہیا کی کیلیں اپنی اپنی جگہ ڈھونڈ کر گھس جاتی
 ہیں اور مٹھوڑی کھٹاکھٹ معاملہ فٹ کر دیتی ہے۔ گاہک چرمر کر تا مسکراتا چل
 دیتا ہے اور وہ پھر جوتوں کی قطار نئے سرے سے جاذب نظر انداز میں جانے
 لگتا ہے۔

کیڈل کورٹ کی موری کے دائیں جانب ایک گیرج ہے جس میں کسی
 زمانے میں موڑ رہا کرتی تھی۔ پر اب وہ موڑ تو ٹرک کے کنارے کھڑی رہتی ہے
 اور اس کی جگہ پندرہ آدمیوں نے چھین لی ہے۔ بیس فٹ مربع جگہ میں پندرہ جی
 نہ جانے کس آسن سے اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ یہ کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیونکہ گیرج

کا دروازہ اوپر سے ہمیشہ بند رکھنا رہتا ہے۔ صرف جھک کر جانے کا انتظام ہے اگر آپ کو شوق ہو تو کیڈل کورٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ جائیے تو آپ کو گیرج کے اندر بہت سے میلے پیر، کھلے گھٹنے اور برہنہ کندھے آپس میں گتھم گتھانظر آئیں گے۔ یہ اعضا جسم عورتوں کے بھی ہیں اور مردوں کے بھی۔ ماڈل کے بھی اور بہنوں کے بھی۔ بہوؤں کے بھی اور بیٹیوں کے بھی۔ پتہ نہیں دہاں کیا پکتا ہے اور کیا کھایا جاتا ہے۔ اچکے ہوئے انسان کی بو ہمیشہ بھبکے دیا کرتی ہے۔

اور وہ موٹر جو کچھ دن پہلے گیرج میں شان سے رہا کرتی تھی اب ٹرک کے کنارے منہ بسو را کرتی ہے، روز صبح باپ بھائی یا بیٹا گیرج کے اودھ کھلے بھاٹک میں سے گردن نہوڑا کر نکلتا ہے اور موچی سے ذرا فاصلہ پر اپنے ذریعہ آمد کو چمکا دمکا کر آئینہ بنا لیتا ہے۔ رات کے چھوڑے ہوئے باسی پھول جھوٹے پتے اور ٹوٹے گلاس موری میں بھار دیتا ہے اور اپنا کاسہ گداؤں چلا کر روانہ ہو جاتا ہے۔

گیرج اور ہوٹل کے بیچ میں ایک بھاٹک ہے۔ یہ کیڈل کورٹ کا بھاٹک ہے جس کے کھمبے پر مالک مکان کا نام اور عمارت کا نام اور سال تعمیر کنندہ ہے۔ یہ عمارت کیڈل کورٹ ہے۔ کورٹ کے معنی ہیں کچری، جہاں مقدمہ اور چالان وغیرہ ہوتے ہیں، مگر یہاں ایسی کوئی حماقت نہیں ہوئی۔ ہاں، یہ اور بات ہے کہ بچے ملے پر رہنے والے فلم اسٹار سے حکومت کو خاص قسم کی پر خاش ہو گئی ہے، اس فلم اسٹار کو آپ نہیں پہچانتے

چونکہ اس نے کبھی کسی فلم میں کام نہیں کیا پھر بھی فلم اسٹار ہے کیونکہ اسے اُمید ہے کہ ایک نہ ایک دن ضرور فلمی دنیا کو اپنی حماقت پر رحم آئے گا اور وہ کسی فلم میں جلوہ افروز ہو کر رہے گا۔

اس کا ذریعہ آمدنی اُمید داری ہے۔ وہ اسی اُمید پر جیتا ہے۔ ویسے اسے کسی نے کبھی بغیر گاڑی کے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ مرغ زریں کی طرح ٹھکتا ہیٹ کا پچھتہ موڑے ایک سے ایک عمدہ کار سے اترتا چڑھتا دیکھا جاتا ہے کتنی ہی فلمی پریاں اسے ہیر و نیا چلی ہیں جس فلم کمپنی میں جاتا ہے وہاں کی ہیر و نیا کو لے اڑتا ہے۔ وہ تو مند ہے، خوب رو ہے، اس کی پیشانی سے بے رحمی ٹپکتی ہے، پر مٹہ کنواریوں ایسا ہے۔ وہ نیلے پیلے اور سبز چنگھاڑتے ہوئے رنگوں کے کپڑے پہنتا ہے اور بالوں میں مصنوعی خم بنواتا ہے اور جب فلمی پریاں اس کے لئے کالے بازار سے دسکی کی بوتلیں لاتی ہیں تو انھیں خالی کر کے وہ ان کے سروں پر پھوڑتا ہے اور جب حالہ ہو جاتی ہیں تو بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے باوجودیکہ وہ اس قدر جلاؤ قسم کام کھنا دیوے پھر بھی اس کے گرد ہمیشہ پریاں پھڑپھڑایا کرتی ہیں۔ شام پڑتے ہی اس کے یہاں گرد و ذراچ کے رنگین مزاج جمع ہو جاتے ہیں۔ آئے دن ناچ و رنگ کے جلسے رہتے ہیں کبھی کبھی وہ بڑے مقدس انداز میں ان پروں سے شادی رچا لیتا ہے، پھر کچھ دن کے لئے کیدل کو روٹ کی بجلی منزل میں موت سی ہو جاتی ہے۔ سارے تھتھے چھپے ایک اجارہ قسم کی خاموشی میں ڈوب جاتے ہیں۔

پھر اس کے بالوں کے خم ختم ہونے لگتے ہیں۔ سوٹ باند پڑ جاتے ہیں اور بجلی منزل میں چھوٹے چھوٹے زلزلے آنے لگتے ہیں کیونکہ فوراً ہی کسی فلمی ہیر و نیا کو شدت

سے ایک ہیرہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اور وہ دوبارہ بالوں میں خمد ڈلوا کر تلاش معاش میں جُت جاتا ہے اور پھر خالی بوتلیں سروں پر پھوٹی ہیں۔ کیدل کورٹ کے نوایسوں کی نیندیں اچھٹی ہیں۔ اور ایک دن بند ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی بیوی بچا کھچا مال سمیٹ کر نود و گیارہ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی چھپے شروع ہو جاتے ہیں، اور اسی طرح یہ زندگی کی چرخی چلتی رہے گی، یہاں تک کہ ایک دن وہ سچ مچ ہیرہ بن کر پردہ سیس پر جلوہ افروز ہو جائے گا یا اسی امید میں اس کے گھیرے بال عمر کی اندھیری زادیوں میں منتشر ہو جائیں گے اس کی کھنچی ہوئی بھنوں میں جھک جائیں گی اور چمکیلی آنکھیں گدلا جائیں گی۔ اس کے تے ہوئے پھٹے جھول کھا جائیں گے جیسے جیسی کر پھیل کر پھکنا بن جائے گی۔ اور پھر نہ ہی پر یاں اس کے گرد منڈلائیگی اور نہ سروں پر خالی دھکی کی بوتلیں پھڑوائیں گی۔ اور پھر وہ لٹی ٹھٹی طوائف کی طرح نہ جانے کیا کرے گا۔ زندگی اسے پھٹی جوتی کی طرح گھٹتے گھٹتے ایک دم چھوڑ کر چل دے گی۔ اور پھر؟ پھر نہ جانے کیا ہوگا۔ اس کا گھر کوئی دوسرا امیدوار لے لے گا اور امید کی شمع جلا کر دکان سجا دے گا۔

دو زینے طے کرنے کے بعد کیدل کورٹ کا پہلا مالا ہے۔ یہاں ایک مڑی جوڑا رہتا ہے۔ پھوٹا سا خاندان۔ نوجوان میاں اور کمسن بیوی اور ننھا منسا ایک بیٹا اور ایک بوڑھی لڑکا ماں۔ نوجوان کہیں پورٹ میں کلر کی کرتا ہے اور کمسن بیوی کسی لوکل اسکول میں معلمہ ہے۔ دونوں کی مجموعی کمائی ایک سو دس روپیہ ہے۔ نوجوان گریجویٹ ہے اور اس کی بیوی مٹرک پاس۔ اور یہ دونوں ملکر ایک سو دس روپے ماہوار کما لیتے ہیں۔ بیالیس روپیہ مکان کا کرایہ باقی اڑسٹھ روپے

میں کا بے بازار سے گیلے کوٹلے اور کرکری شکر کے علاوہ چار جانوں کا کھانا پینا، سیر تفریح سب کچھ ہو جاتی ہے۔

جب ہندوستان آواذ نہ تھا تب بھی یہ خاندان ہمیں رہتا تھا۔ جب یہاں ایک باپ بھی رہتا تھا۔ یہ گھر ہمیشہ مشہور لیڈروں کی نقاد پر سے آراستہ پیراستہ رہا کرتا۔ اور جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو سب سے زیادہ روشنی اور جھنڈیاں انہیں کی بانگنی میں لگی تھیں، گھر کے دروازے پر سیڑھیوں پر اور تصویر کے چوکھٹے میں فریم کیا ہوا "جے ہند" نہایت روشن اور منور ہے۔ کمرے کی سب سے بڑی دیوار پر سو بھاس بابو کی سیلیوٹ کرتی تصویر ہے۔ اس کے اوپر کچے سوت کے ہار پٹے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ گئے سال کا ذکر ہے۔ اس سال ۵ اراگست کو ان کی بانگنی میں جھنڈوں کی تعداد سکرٹ گئی تھی اور دیئے دو چار ہی گھنٹے مٹا کر رہ گئے اور دیوار پر لکھا ہوا "جے ہند" ماذ پڑتا جا رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ۵ اراگست کو جب آزادی آئی تو گورنمنٹ نے کنٹرول نہیں کیا اس لئے ساری آزادی بلیک مارکٹ میں دھری گئی جس کا جی چاہے آزادی لے آئے۔ پر ذرا مشکل سے ملتی ہے کیونکہ وہی بات ہے کہ مانگ زیادہ ہے اور سپلائی کم۔ آزادی کوئی ایسی ویسی چیز تو تھی نہیں کہ دھوپ اور ہوا کی طرح ہر ایک ایرے غیرے ختو خیرے کو بانٹ دی جاتی، نہایت احتیاط سے سینت کر رکھی گئی ہے۔ وقت ضرورت بانٹ دی جائے گی۔

اور اسی بیڑا رے کی آس لگا یے یہ جوڑا زندگی کا قرض اتارنا چلا جا رہا ہے۔ یوں ہی "جے ہند" اور قومی لیڈروں کے سایے میں کمر بھکائے ایک سو دس

روپے میں گھر کی آگ سُلگتی رہے گی۔ یوں ہی نوجوان یہاں سے فورٹ اور فورٹ سے
گھر آگؤن میں بٹھا رہے گا اور کسمن بوی، دوپہر کے وقفے میں ننھے کودودھ پلانے
لاہتی دودھ آتی رہے گی۔

پھر ایک دن یہ نوجوان اپنی جگہ منے کو سوپ کر چل دیگا اور وہ ننھا نوجوان
ہو کر اور بھی بڑے بڑے لیڈروں کی تصویروں سے کمرے کو سجائے گا اور سیڑھیوں پر
لکھا ہوا "جے ہند" نئے رنگ سے جگمگا اٹھے گا، پھر ایک سو دس روپے آئیں گے اور
گیلے کوٹلوں اور کرکری شکر کے بھینٹ چڑھا جائیں گے۔

دو زینے اور چڑھئے یعنی زمین سے چار زینوں کی اونچائی پر ایک نہایت
اعلیٰ خاندان کی اصلی جیتی جاگتی فلم اسٹار سکونت پذیر ہے۔ وہ میری سہیلی ہے۔ یہ میل
جول اس زمانے کی یادگار ہے جب میں نے بمبئی پر پورے طور سے قدم نہ ڈالے تھے اور
ہر فلم اسٹار کو جیتا جاگتا دیکھ کر چینیں نکل جاتی تھیں۔ عرصے سے ہم ایک دوسرے کی خوشی
اور غم میں شرکت کرتے آئے ہیں۔ راضی خوشی نہ سہی کم از کم مجھے تو اس کے سارے
غموں میں شرکت کرنا ہی پڑتی ہے۔ ویسے وہ دیکھنے میں اچھی خاصی انسان معلوم
ہوتی ہے مگر ایک نہایت ہی مکروہ لت اس کو چمپٹ گئی ہے۔ وہ ہے عشق بازی
وہ تعلیم یافتہ ہندی ہے لہذا اس کے عشاق میں عموماً شعرا ادیب اور جرنلسٹ بھی پائے
جاتے ہیں۔ میری سہیلی کا کہنا ہے پتہ نہیں کہانتاک درست ہے کہ وہ سب کے سب
اس کے عشق میں گرفتار ہیں یا گرفتار تھے، یا گرفتار ہونے کے آرزو مند ہیں۔ پتہ نہیں

اُسے یہ شبہ کیوں ہو گیا ہے کہ میں عشق کے معاملے میں ایکسپٹ ہوں کیونکہ وہ ہمیشہ تازہ واردات کے موقع پر مجھ ہی سے رلے لیتی ہے۔ جہاں اس کے تازہ عاشق سے چٹھاک چلی جو کہ ضرور چلتی ہے۔ چونکہ وہ عشق صرف لڑنے روٹھنے اور ملنے کے لئے کرتی ہے تو میرا دم سوکھ جاتا ہے۔ آئے دن میری جان پر مقدمے دائر ہونے لگتے ہیں۔ اور تو اور اُسے عشق کے جلد مراحل طے کرنے کے لئے میری گھر موزوں نظر آتا ہے۔ میرے ہی صوفوں پر روٹھے مینتے ہیں۔ میرے ہی گلدانوں سے ایک دوسرے کے سر پھٹتے ہیں اور بعض زمانے میں تو مجھے خود اپنے کمروں میں باقاعدہ کھنکھار کر، ہوک بجا کر جانا پڑتا ہے۔ کتنی بار جی جا ہا کہدوں مجھ کو تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے یہ دُکھڑے سننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں کیا میں کسی بے مصرف ہوں کہ سوائے تم جیسی ناکارہ چیز کے اور کوئی ابھن میری زندگی میں نہیں میں بیٹھ کر تمہارے عاشقوں کے دُکھڑے سنوں یا سوچوں کہ اناج کتنا کم ملتا ہے راشن پر چاول تو جیسے بونے سے پہلے بیج سڑ گیا تھا "جب سے کنٹرول کھسکا ہے آنکھیں لٹھے نمل کو ترس گئی ہیں۔ کہتے ہیں کفن کا کوڑا ملتا ہے۔ کاش مرنے سے پہلے وہ کفن والا لٹھا ل جائے، تو ایک غرارہ مزے سے بن جائے۔ پھر شکر میں کتنی دھول ہوتی ہے۔ جانو گئے ہی کر کرے بوے جانے لگے۔ پر تم کیا جانو ان باتوں کو۔ یہ جو عاشقوں کا چسکا بیٹے بھٹائے جان کو لگا بیٹھی ہو کہ سال کے بارہ مہینے بس ان ہی کی جان کا رونا کہ اب کون سی فصل آئی۔ کون سے کائے جائیں اور کون سے تازہ بوئے جائیں۔ کن کی ادھیڑ بُن کی جائے اور کون سے جھاڑ پونچھ نیپتلیں کی گولیاں ڈال کر اسٹور کر دیئے جائیں کہ وقت ضرورت کام آسکیں۔

اور پھر میرا جی بول اٹھتا ہے اور موچی کی خام چمڑے اور پرانے جوتوں الی
 دکان انھوں میں پھر جانی ہے مجھے اس کے عاشق جوتوں کی ایک طویل قطار کی طرح
 معلوم ہوتے ہیں۔ اونچی ایڑی کے، نیچی ایڑی کے، بغیر ایڑی کے، ولایتی، ہندستانی
 نیڈل اور ڈانگ شو، ڈانگ شو، اور پلیٹ فارم شو، روپے چمکیلے اور پھٹے
 ہوئے چمپے اور گھتیلے، پر کوئی بھی تو ان میں سے فٹ نہیں کسی کا پنچہ کاٹا ہے
 تو کوئی ایڑی پر چھالا ڈالتا ہے۔ کسی کا قسمہ ڈھیلا تو کسی کا بکسوتاگ۔ کوئی بھی تو ایسا
 نہیں کہ مزے سے پیر میں ڈال کر زندگی کی یکدندی پر ٹھمکتی لمچکتی چلی جاؤ۔

ان کے تازہ ترین عاشق سے میرا پرانا بیر ہے۔ وہ ایک عرصے سے مجھ سے
 ایک فلمی کہانی کھوانا چاہتا ہے اور اتنے بھاؤ تاؤ کمر لبا ہے کوئی دم میں کمر ٹوٹا جاتا
 ہے اور وہ بھی سمجھ گیا ہے کہ کچھ دن بعد میں اس کی مرضی کے مطابق داموں پر لکھنے
 پر مجبور ہو جاؤں گی، پھر اس میں وہ جملہ رد و بدل کر کے اپنی بوڑھی داشتہ کو میرے تھیل
 کی پندرہ سالہ جھوڑی بنا دے گا اور تھیل تھیل کرتے دُنبے جیسے ہیر دو جو حاملہ عورت
 کی طرح پھیل پھیل کر چلتا ہے اور جس کے سینے پر اتنا گوشت ہے کہ باسانی ۳۲ نمبر کی بریزر
 پہن سکتا ہے۔ جواں سال ہیر و کا بارٹ مے دیکھا۔ پھر جب یہ بوڑھی گھوڑی اور
 ڈھیلا ہتھی، پھدک پھدک کر باغوں میں دوگانے گامیں گے۔ میرا سر شرم سے نیچا ہوجا
 گا۔ میں کسی کو نہ بتاؤں گی کہ یہ کہانی میں نے تخلیق کی تھی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ
 کہانی ہنسنے کو نلوں بھگی شکر اور کیا اب لھٹے نے اس کو سوچی تھی۔ کالے بازار سے لھٹا
 اور ٹمل خزیروں کی اور بھیلے کوٹلے کہ اس کی آسج سلگتی ہے اور پھر مجھے کہانی لکھنے کا معاوضہ
 ملے۔ ایک عجیب و غریب جگہ ہے جس میں فلم ڈاکٹر اور کالا بازار ایک دوسرے کی

دم پکڑے چاک پھیریاں لے رہے ہیں۔ میں فلم ڈائریکٹر کو اور فلم ڈائریکٹر کا لے بازار کو اور کالا بازار مجھے منسوبی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اس جگر میں مجھے کتنی متلیاں آتی ہیں! — خالی متلیاں پھل ندارد! اور یہ متلیاں یوں ہی آتی رہیں گی! یہاں تک کہ فلم اسٹار کے چھدرے بال جھڑ جائیں گے۔ چہرہ ناقابلِ مرمت ہو جائیگا اور وہ اپنے عاشقوں میں کسی ایک کے حق میں قرعہ ڈال دے گی اور اس کے گھر میں بیٹھ کر موتی نہ ہونے کی فکر وہیں پڑی پھولا کرے گی اور ایک دن فلمی کہانی لکھتے لکھتے میں اپنا قلم چبا کر نگل جاؤں گی اور ان گیلیے کو ٹلوں کو اتنا پھونکوں گی کہ وہ بھڑک اٹھیں گے۔

اگر آپ کی ٹانگیں شل نہ ہو گئی ہوں تو دو زینے اور طے کر ڈالئے۔ یہ کیڈل کورٹ کا تیسرا مال ہے۔ اگر آپ دروازے پر دستک دیں تو ایک اجازت صورت مرین دروازہ کھول کر جھانکے گا اور سمجھ کر آپ سے درخواست کرے گا کہ بھائی غل کیوں مچاتے ہو۔ خواہ غل، بالکل نہ مچ رہا ہو، یہ بیچارہ ایک مزدور پیشہ آدمی ہے۔ یہ جو آپ کو سمندر کے کنارے چاٹ پکوڑی کی دکان میں نظر آتی ہیں۔ یہ قریب قریب نصف اسی کی ہیں جنہیں اس نے بھیکہ پر دے رکھا ہے وہ نہایت ذلیل درجے کے ٹھاکر ہیں اور بہت کم منافع لاتے ہیں۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ میرین لائن پر اس کی ایک قطار میں تین عمارتیں ہیں۔ بانڈرا میں دو بنگلے ہیں، ایک تو غریب نے اپنے ذاتی مصروف کے لئے بنوایا تھا۔ تمام ایرکنڈیشن کرایا مگر پھر رنار بھٹیوں پر دیا کھا کر صرف پچیس ہزار روپے لے کر دیریا۔ بیچارہ بلڈنگ اپنے لئے بناتا ہے لوگ لے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود اس بوسیدہ عمارت میں رہتا ہے۔ اب تو یہ حال ہے

کہ مکان کی نو پڑھی اور پکڑیاں ٹکیں۔ کرے بھی تو کیا؟ لوگ چھوڑتے ہی نہیں۔ اب وہ دن دور نہیں کہ وہ اپنے موجودہ مکان کو پکڑی پر دے کر فٹ پاتھ پر موجی کے شانے سے شانہ ملا کر پڑ جائے گا۔ دنیا اسے سرمایہ دار سمجھتی ہے حالانکہ اس کی روح تاں ننگی سچی ہے۔ اس کا سارا روپیہ کاروبار میں پھنسا ہوا پھوٹتا جا رہا ہے۔

ان مکانوں کے علاوہ فٹ پاتھ پر پکڑے کی اس کی ہزاروں چھوٹی چھوٹی ڈکانیں ہیں، یہاں وہ ٹل سے پورے حقان لاکر ان کے کٹ پس بنا کر کالے بازار کے بھاؤ بیچتا ہے۔ یہ فٹ پاتھ پر سارے مٹی میں کالا بازار پڑا جگمگاتا ہے، مگر اسے نہ پولیس کا سپاہی دیکھتا ہے، نہ ہمارے دیس کے مقدس لیڈر جیسے وہ جادو کی ٹوپی پہنے ہو۔

دو زینے اور گھسیٹ ڈالے۔ اپنی ٹانگوں میں ویسے دم تو نہ رہا ہوگا۔ یہ کیڈل کورٹ کی چھت ہے۔ یہاں صرف ایک کوٹھری ہے جس میں مالک مکان کا فالٹو کوڑا مثلاً پرانی ٹنکی، ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں، موٹر کے گھسے ہوئے ٹائر، خاک دھول، بھینگر اور کڑیوں کے درمیان ایک میلی سی درمی انسانی ہاتھوں سے بچھائی نظر آئے گی، ایک طرف کچھ نئے پرانے کاغذوں، رسالوں اخباروں کا ڈھیر رستی پر میلے کپڑے۔ ایک کونے میں ایک انگیٹھی جس پر سیاہ المونیم کی کیتلی اور دو چار پڑیاں چائے گڑ شکر کی، ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی انسان کی ختم کی شے بھی سیرابیتی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس پر اسرارستی کے دیدار سے مستغنی ہو چکے ہیں۔ رات کو آخری ٹرام کے ٹک جانے کے بعد کیڈل کورٹ پر جہرت انگیز ناٹا چھاجاتا ہے، ایک پر اسرار قدموں کی چاپ گونجنا شروع ہوتی۔ پنی تلی

تھکن میں ڈوبی ہوئی چاب جیسے ہزاروں قدم ایک لے سر میں غرق چل پھر
ہے ہوں۔ پھر یہ چاب کیڈل کورٹ کی طرف سرکنا شروع ہوتی ہے اور پھاٹک
میں داخل ہو کر لمبے اور تاریک زمینوں پر رینگنے لگتی ہے۔ اسی وقفے سے اسی
دن سے قدم ایک سیڑھی پر گرتے اٹھتے ہیں اور بغیر سستائے کیڈل کورٹ کی
چھت پر پہنچ جاتے ہیں۔ اگر کبھی رات کو ایک بجے کے بعد کیڈل کورٹ
میں آنکھ کھل جائے تو آپ ان قدموں کو سنتے سنتے کانپ اٹھیں گے جیسے کوئی
روح عالم بالا کو چڑھ رہی ہو، ایک ایک چاب گن لیجئے۔

یہ قدم ایک عجیب اور غریب شے کی ملکیت ہیں۔ میں اسے شے ہی
کہوں گی کیونکہ کیڈل کورٹ کے باسی نہ اس کا نام جانتے ہیں نہ مذہب جن لوگوں
نے اسے دیکھا ہے انھیں بھی شک ہے کہ وہ پتہ نہیں زندہ ہے یا کسی مردے کا بھت
کچھ لوگوں کا خیال ہے وہ کوئی پریشان روح ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں سرکاری جاسوس
ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ فرار شدہ مجرم ہے اور اس کے نام کا وارنٹ نکلا
ہوا ہے۔ اور واقعہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ ایک بار سنا کہ وہ ایک ایسے اخبار سے
دبا ہوا ہے۔ جبکہ ہر پرچہ ضبط ہو چکا ہے یا قابل ضبط ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ کسی
مشاعرے میں اس کو پولیس نے دھر لیا ہے۔ پھر ایک نالک میں کچھ ایسا فساد اُبھر
نظر اُھر گیا کہ پولیس نے گھیر لیا۔ مگر اس کی ہستی کچھ ایسی پھینکتی کہ نہ جانے کہاں دبا جاتا
ہے۔ وہ جیسے کھٹل ہوتا ہے ناخندی قسم کا گدی میں کاٹا ہوا اور اس سے پہلے کہ شکار
سمجھنے پنڈلی میں چٹا لیا، پنڈلی سلی تو کمر میں دودڑے ڈال دیے۔ تو یہی صفت
اس کی ہے۔ گورنمنٹ بلبار ہی ہے، کھجور ہی ہے اور سرپیٹ رہی ہے۔ پولیس دودڑ

رہی ہے۔ مگر یہ اس کی ٹانگوں میں سے نکل کر بھاگ جاتا ہے۔ کیڈل کو رٹ کے
سائے کرایہ دار جانتے ہیں کہ وہ یہاں رہتا ہے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں
کہ اسے پکڑوادے۔ ایک دفعہ کسی نے کوشش کی بھی تو وہ پولیس کے جانے
سے پہلے بھینگر بن کر غائب ہو گیا اور پھر کسی نہیں وہ پر اسرار ہیروں کی چاب
کیڈل کو رٹ کے زینوں پر نہ سرسرائی۔ لیکن پھر ایک دن اسی طرح وہ ہزاروں
پاؤں ایک نے سر میں ڈوبے پھر سے چڑھنے اترنے لگے جن لوگوں نے اسے
دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہی سچا پتلون اور متمیز ہے وہی سچے گال اور
الجھے بال۔ شاید وہی لوٹ کر آگیا ہے۔ مگر شاید۔ کیونکہ یقین سے نہیں کہا
جاسکتا۔

اور یہ پر اسرار قدم ہمیشہ اسی طرح رات کی پر اسرار تاریکی میں گونجتے
رہے ہیں۔ ایک تھک جائے تو دوسرا جوڑا ان کی جگہ لے لے گا اور دوسرا
تھک جائے گا تو تیسرا۔ اور یہ لامتناہی قدموں کا سلسلہ اسی طرح بغیر غرض
کھائے چلتا رہے گا، اور ایک ایک قدم ہزاروں قدموں میں بستا چلا جائے
گا۔ تو یہ کیڈل کو رٹ ہے۔ اوپر سے نیچے تک، فٹ پاتھ سے لے کر خالی
آسمان تک، اگر آپ کو ایک پلنگ کی ضرورت ہو تو ہمت سے کہیے.....
وہ آپ کو نہایت نامقبول پکڑی کے عوض ایک ادھ کونا کھدرا رہنے کو دے
دیگا۔ جب لیڈروں کی تصویریں جاگ پڑیں گی اور شکر
میں سے ریت کے وزے چھان ڈالیں گی۔ ان گیلیے کو ٹلوں کو اتنا
دھونکیں گی کہ ان میں سے شعلے بھڑک اٹھیں گے اور یہ ٹھٹھرن اور فاقہ

ختم ہو جائیں گے۔ اور موجی کے سر پر کوڑا نہ برسے گا اور کیڈل کورسٹ کی
 چھت پر چھپے ہوئے بھینگر بوسیدہ مال کو چاٹ جائیں گے.....
 مگر نہیں..... بھلا کہیں تصویریں بھی جاگا کرتی ہیں۔

پوم پوم ڈارلنگ

جب خاندان میں ایک نئے فرد کا اضافہ ہوتا ہے تو دھوم دھام سے لوگ اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ جب کسی نے دکھنے والے کا پہلا مضمون کسی رسالہ میں شائع ہوتا ہے تو سارے ماموں چاچا، خالہ، پھوپھی مل کر اپنی اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ جب قرۃ العین کا پہلا افسانہ شائع ہوا، تو ایسا معلوم ہوا کہ افق ادب پر ایک نیا نویلا ستارہ طلوع ہو گیا۔ چاک دما کے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب یہ ننھا منّا ستارہ آفتاب ادب بن کر آنکھوں کو خیرہ کر دے گا۔ ادبی حلقوں میں چہ میگوینا ہونے لگیں۔ قرۃ العین کا مضمون دیکھ کر رسالہ پر پھینکا پھینکا پٹی شروع ہو جاتی، واہ واہ کیا کہنا کرشن چندر جی ٹھوس رومانیت، حجاب اسماعیل جی طلسمی فضا میں اور عصمت جیے چٹختے ہوئے مسکالے..... جی نہیں خاص قرۃ العین کی اپنی تراش تراش رنگینی اور لوج جو کسی خدشے کا محتاج نہیں۔

”اب خیر منائیے ادیبہ صاحبہ! احمد عباس نے ڈرایا اور میں نے واقعی خیر منائی یہ چھوٹے تو اپنے ساتھ بڑے بن جانے کا خمیر لے کر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ بعد میں آنے

والے بہت سے جھیلوں سے بچ جاتے ہیں۔ پہلے گزرنے والے بہت کچھ کیل کانٹے رستے میں سے ہٹا چکے ہیں اور نئے اینوالوں کو آگے بڑھنے میں بہت سی آسانیاں مل جاتی ہیں۔ لیکن ایک بات تو ہوگی۔ اب وہ اکیلا اکیلا نکو پن نہ رہے گا۔ میدان بھرتا جا رہا ہے۔ لاجرم خدیجہ آہی چکی ہیں اور اب یہ نیا تیر تو یقیناً نکلنے پر بیٹھنے کے لئے ہی چلے پر چڑھا ہے۔ اب تو لوگ آنکھنے والا مرد ہے یا عورت؟ کے سوال میں ابھ کر قلا بازیاں کھانا کم کر دیں گے۔ اب تو یہ جانور کہیں کہیں کے بجائے ہر جگہ پایا جائیگا۔ کیونکہ زمانا بھی تو تہذیب نسواں اور تہذیب مردان کے بجائے تہذیب انسان کا سوال اٹھا رہا ہے۔

ایک کے بعد دوسرا 'میسرا' چوٹھا اور پانچواں مضمون بھی نکلا۔ ستارہ اسی جگہ جگمگاتا رہا۔!

اس کا محور بدلانہ چال ڈھال !!
دیکھنے والوں نے آنکھیں مل کر دیکھا اور بغور دیکھا کہ کہیں یہ ان کی آنکھیں بڑھاپے سے کمزور تو نہیں ہوتی جا رہی ہیں۔ ستارہ تو کچھ ٹٹمانے لگا ہے !!!
"مٹھرجی ذرا سینڈریلا کے زمین پر اترانے کا انتظار کرو" ناقد نے ڈھارس بندھائی مگر وہ خوابوں کی "چارمینگ" رانی اسی طرح دور خلاؤں میں ٹٹماتی رہی۔

زمانے کی گھڑیاں نے بارہ بجادیئے اور جادو کی پھری کا طلسم ٹھک کر ٹوٹنے لگا۔

"اجی آپ کی قرۃ العین کیا لکھتی ہیں؟" جی ہاں، میری قرۃ العین۔

آخر ہمارا اتنا قریب کا رشتہ ہے نا۔ دونوں ایک ہی رنجیر کی اگلی پھیلی کرٹیاں ہی تو ہیں۔ نئی کرٹیاں تو پرانی کرٹیاؤں سے زیادہ مضبوط ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں تو پھر یہ بھول چوک کہاں ہو گئی خدا یا !

اور میں نے بڑے اہتمام سے ایک طویل ناصحانہ خط لکھا شروع کیا۔ جس میں میں نے بعد دعا کے واضح کرنا چاہا کہ بھئی یہ شو شو، فوفو، بھارت ناٹیم، سیولے، ڈیلا مار کے سوئمناگ پول میں کب تک ڈکیاں لگاتی رہو گی۔ ایک بار ذرا باہر جھانک کر بھی تو دیکھو۔ ایک ہی نکتے پر کتنے چکر دو گی۔ کیا ساری عمر میری گوراؤٹ ہی پر گھماتی رہو گی ؟ لوگ کہیں بولانہ جائیں اور پھر جب وہ چڑھ کر تنقید کریں گے تو اس میں جھجلاؤ اور انتقام کے نشتر پوشیدہ ہوں گے۔ پھر تمہارا دل ٹوٹ جائے گا اور تم اس کوپے سے بچ کر کوئی دوسری ”ہو بی“ پکڑ لو گی !

خط لکھنے کے بعد ایک دم خیال آیا کہ میں میرا خط ہی اس پہلے پتھر کا کام نہ کر جائے جس کی طرف میں اشارہ کر رہی ہوں۔ کہیں میرے اعتراض سے دل برداشتہ ہو کر چڑیا پھرے اڑ کر دوسری ڈال پر نہ جا بیٹھے۔ لوگ کہیں گے کہ ”یہ ادب کے ٹھیکیدار“ نے آنے والوں کو دھمکاتے ہیں تاکہ قبل اس کے کہ ان بیچاروں کا فن پختہ ہو کر مقابلے میں آئے انھیں مار بھگائیں۔ فنکار بڑے سادہ ہوتے ہیں نا۔ دوسرے بھئی شاید میں قرۃ العین کے زمانے سے پیچھے ہوں، اس لئے ان کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ لہذا میں نے ان کے ہم عمروں سے روشنی حاصل کرنا چاہی لیکن انھیں بھی اپنا تمخیال پا کر کچھ خود اعتمادی پیدا ہوئی اور مجھے افسوس ہوا کہ میں نے وہ خط کیوں پھاڑ ڈالا۔ اور آج جب میں یہ مضمون لکھ رہی ہوں احمد عباس

پھر کہہ رہے ہیں "تم نے جان بوجھ کر ایک ہونہار ادیبہ کی راہ نہائی نہ کی، اس کی خامیوں کو سچتہ ہونے دیا۔ کیونکہ تم جانتی تھیں، اگر اس کی خامیاں دور ہو گئیں تو وہ سب کو پھلانگ کر میلوں آگے نکل جائے گی۔"

یہ لیجئے، سانپ کے منہ کی چھبھ نذر نہ نکلے بنے نہ اگلے۔ زمانہ بھی تو بڑا نازک ہے۔ کسی پر تنقید کرو تو لوگ کہتے ہیں کمیونسٹوں نے بہکا دیا ہے جی۔ احمد عباس کو عسکری اور رامانند ساگر کو ایم۔ اسلم سے دور کا بھی رشتہ بتا دو تو جان موٹی ٹیسی گالی دیدی۔ ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ لکھنے والے پڑھنے والوں کے لئے ہی لکھتے ہیں، کچھ چٹخارے لینے کے لئے نہیں لکھتے۔ پڑھنے والوں کی تنقید اور ستائش دونوں کے برابر حقدار ہیں۔ وہ ادیب جو تنقید نہیں سہہ سکتے وہ نہ ہی زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ تنقید کرنے والے کا رتبہ اگر وہ ایمانداری سے اپنا فرض انجام دے تو بہت بلند ہے۔ ایک طرف وہ ادیب کے دماغ کو خوراک پہنچاتا ہے تو دوسری طرف ادب کی حفاظت کرتا ہے۔ اس ادب کی جس کا زندگی سے دامن بندھا ہوا ہے، اور اس طرح وہ زندگی کا بھی محافظ ہے جیسے ہر انسان کو دندان ساز کے پاس وقتاً فوقتاً جلانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ہر ادیب کو تنقید کی ضرورت ہے۔ دانت اکھڑوانے میں دکھ تو بڑا ہوتا ہے مگر صحت بھی جی جیتی ہے صرف صحیح تنقید ہی بہکنے والے قلم کو سیدھا اور صحت بخش راتہ دکھا کر غلط موڑے بچا سکتی ہے۔

لیکن جب قرۃ العین کو خضر راہ دکھانے چلے تو خود اندھیارے میں گھر کر ٹپٹا

گئے اور دھکا دے کر واپس لوٹ آنے کے سوا کچھ نہ سوچھا۔ وہ تارا جو آفتاب بن جانے کے آثار لے کر ابھرا تھا بھٹک کر "ستاروں سے آگے" کچھ بھی نہیں کی خلا میں گم ہوتا چلا گیا۔ قرۃ العین کو سمجھنے کے لئے بڑی آسانی ہوگی، اگر نذر سجاد حیدر کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ جو ان کا بنی رشتہ ہے، وہی ان کا ادبی رشتہ بھی ہے۔ ادبی شجرے میں "نذر سجاد حیدر" ماں ہیں تو قرۃ العین بیٹی۔ دونوں کا واسطہ ایک ہی طبقے سے بڑا۔ لہذا دونوں کے مسائل بھی یکساں ہیں۔ وہ دکھ جو اختر النساء نے جھیلے تھے قرۃ العین کی ڈولی پوئی اور امینی جھیل رہی ہیں۔ دکھڑا وہی، یعنی ٹھیک ناپ تول، شوہر کی نایابی۔ اختر النساء کے والدین جابر ہونے کا الزام مانتے پر لئے ہوئے تھے اور ڈولی پوئی کے والدین مال تیار کر کے ڈرائنگ روموں میں بٹھا دیتے ہیں۔ گھیر گھیر کو کم از کم ۸ سو کمانے والے سکار لاتے ہیں۔ اور کھلی اجازت دیتے ہیں کہ مارو پھندا۔ پھندے چلتے ہیں۔ سکار پھاندا پھونڈی کرتے میں پھنس گئے تو ٹھاٹھ کا ایک ایٹ ہوم ہوتا ہے۔ ورنہ ڈولی کا سکار زونی لے بھاگتی ہے۔ شو شو کو پوم پوم ہڑپ کر جاتی ہے۔ اور ٹوڈلر کو فی فی ڈکار جاتی ہے۔ یہ ہے لب لباب ان چار منگ لوگوں کی رام کہانیوں کا۔

اختر النساء دن کا سکار ہو جایا کرتی تھتی۔ پوئی موتی ذہنی طور پر مدقوق ہو جاتی ہے۔ گئے انسانوں سے بہتر نظر آنے لگتے ہیں۔ ہر چیز کے پیچھے "کچھ نہونے" کا احساس تانے لگتا ہے۔ "سب کچھ حاصل کرنے پر بھی موت پر اور کچھ نہ ہونے پر فتح حاصل نہیں ہو سکتی" زندگی اتنی عجیب بن جاتی ہے کہ اُسے کوئی معنی نہیں پہنچائے جاسکتے۔ اور وہ نہیں جانتیں کہ "وہ جنگل، وہ پہاڑ، وہ ندیاں، وہ جگہیں کہاں ہیں یہاں

زندگی ہے۔“

اختر النساء کا دشمن سماج تھا۔ پوتی ڈوٹی اور شو شو کے دشمن واہمہ، شعور و تحت شعور لاشعور اور قنوطیت میں سماج سے تو کوئی رشتہ بھی سکتا ہے مگر ان ذہنی بھوتوں سے کون لڑے Cynic بن جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ نذر سجاد حیدر نے کسی عنصر سے تو بغاوت کی، قرۃ العین حیدر میں وہ بھی سکت نہیں۔ جہاں تک ترقی پسندی کا سوال ہے، ان دونوں کا رشتہ بالکل الٹا نظر آتا ہے۔ یعنی ماں بیٹی سے آگے سوچتا ہے نذر سجاد حیدر جاگیر داری نظام کے زوال کے وقت اٹھ اٹھتی اور قرۃ العین حیدر سرمایہ داری نظام کے زوال کی پیداوار ہیں۔ مگر انھوں نے کم از کم گرتی ہوئی دیواروں سے لپٹ لپٹ کر سر نہیں پھوڑا تھا۔ جاگیر داری نظام کی خامیوں اور کوتاہیوں پر تکیہ ہی کیا ہے۔ حالانکہ ان کے آئینے کار گئے کیونکہ وہ اس نظام کو دوبارہ کھڑا تو نہ کر سکیں۔ لیکن قرۃ العین حیدر سرمایہ داری نظام کے ڈوبتے ہوئے سورج کے اندھیا رے میں ہاتھ پیر مار رہی ہیں۔ اس کی عفونت بھری بوسیدگی سے انھیں گھن آتی ہے، مگر پیار بھی ہے۔ وہ اپنے طبقے کو اس مچھلی کے مانند سمجھتی ہیں جسکے ارد گرد کا پانی سرسبز ہے مگر خشک ریت پر بھی موت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ کیوں پوتی ڈوٹی کے حسن بھی ہے دولت بھی ہے تعلیم بھی ہے کلچر بھی ہے۔ پھر بھی پوتی ڈوٹی سے شادی کرنے کے بجائے زونی کے چکر میں پھنس جاتا ہے! جیہی زونی کو پھوڑ کر پوم پوم پر کیوں مٹا ہے؟ یہ جاننے کے لئے اس کا راز معلوم کرنا ضروری ہے کہ جب سرمایہ داری نزع کے عالم میں دم توڑنے لگتی ہے تو ذہنی اور اخلاقی انحطاط لازمی طور پر شروع

ہو جاتا ہے۔ جب ایک چیز گلنے سرٹنے لگتی ہے تو اس سے ملحقہ چیزیں بھی بجبا
 اٹھتی ہیں۔ ایک سرمایہ دار روٹی کا بیو پار چھوڑ کر لہسن پیاز کا دھندا بھال لیتا ہے
 بوٹی، شوٹم کو چھوڑ کر رفینہ کو پکڑ لیتا ہے، دونوں کی ایک ہی ذہنیت ہے۔ ایک ہی پیشہ
 اور ایک ہی مقصد۔ جس میں زیادہ منافع ہو وہی ان کا مذہب، وہی ان کا عشق اور
 وہی ان کی زندگی۔ اس کے باوجود ایک سرمایہ دار یہ بھی جانتا ہے کہ سب کچھ پا کر بھی
 ”کچھ بھی نہیں“ کا احساس اس کا دہم نہیں بلکہ ایک بھٹوس حقیقت ہے۔ اس کا طریقہ کار
 انسانیت کے فلاح و بہبود کے لئے نہیں اسکی ساری اسکیمیں، سارے مارشل پلین سارے
 سمجھوتے اور گتھ بندیاں آگے جا کر ایک ایسے نکتہ پر ختم ہو جاتی ہیں جہاں احساس کچھ
 بھی نہیں“ کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا انجام فنا ہی ہے۔ وہ کانٹے
 کی نوک پر ٹینگا ہوا ہے اور اس کھولتے اُبلتے طوفان کا چرٹھاؤ دیکھ کر لرز رہا ہے۔ جو
 دن بدن گھیرا تنگ کرتا آرہا ہے۔

اس کی نئی پودہ بے اطمینانی یہ خوف، یہ زندگی سے فرار اور ”کچھ بھی نہیں“ وژ
 میں لے کر جنم لے رہی ہے، ان کے شعور اور لاشعور اس ہی سانچے میں ڈھل کو پیدا ہو
 رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں مگر کھلے بندوں نہیں کہہ سکتے کہ ان کے دشمن کون ہیں۔ قرۃ العین
 حیدر کبھی کھلے بندوں یہ نہیں کہہ سکتیں کہ عوام ہی ان کے سکون اور عیش کے دشمن ہیں
 اور ہوا بن کر ڈراتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ بڑے عوام دشمن بھی کھل کر اپنے
 وجود کا اعلان نہیں کر سکتا۔ عوام کو لٹنے کے لئے ٹھگوں کو بھی سبھکت کا روپ ہارنا
 پڑتا ہے۔

سرمایہ داروں کے اکیٹیوٹوں کو زندگی کے ہر موڑ پر کمیونسٹ دیکھے ہوئے

نظر آ رہے ہیں۔ سرکار تو یہ بھی بھوکے پیٹ میں دیکھے ہوئے کمیونسٹ پر لاٹھی چارج اور گولی سے وار کرتی ہے۔ مگر قرۃ العین حیدر نہایت ہی رومانی ماحول میں نہایت ہی بقتہ نور قسم کی حسیناؤں کے ذریعے سے کمیونزم پر طنز فرماتی ہیں۔ ان کا کہنا کلی، منی پوری اور رمبا میں مست جوہی کی کلیاں سونگھنے والا قلم جب لفظ کمیونسٹ لکھتا تو ایک دم کالے ناگ کی طرح پھینکارنے لگتا ہے۔ ایک ہی سانس میں کھینچو تاک چرچ، کمیونزم اور یوگا کی قے کر ڈالتا ہے، اور اس وقت وہ اپنے طبقہ کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے۔ پھر صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قلم میں کون سی سیاہی بھری ہے۔ اور اس کا نب کس فرم کا دھلا ہوا ہے۔ ان کے "چارمنگ لوگ" جمی کے پانچ عقلمند کتوں کی طرح کسی پارٹی میں شامل ہونے کا پروگرام نہ بناتے ہوئے جب مفکرین کا روپ دھار کر فلسفہ بگھارنے کی کوشش فرماتے ہیں تو برا ہی پر لطف منظر نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ ہیڈی لامار بیٹی گریبل، روبرٹ ٹالمیر اور چارلس بولے کے کالی جیڑی والے چربے اچھے خالص سیاست دان بننے لگتے ہیں۔ "کس پروٹ" اور "برگنڈی" کے مستند استعمال کے بعد یہ کام کافی آسان بھی تو ہے۔ اس وقت ان کی نرگسی آنکھوں کو اشتراکی اشتعال، دہشت پسند کانگریسی، ادنیٰ سب کے سب گڈ ڈکھائی دیتے ہیں اور یہ مفکرین اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ سارے کمیونسٹ ان حسیناؤں کے گھائل نامراد عاشق ہیں جو فرار کی غرض سے اور کچھ جلد پھپھو لے پھوڑنے کے لئے بیچاری بورژوا لڑکیوں کی ذہنیت پر لکچر دے کر پارٹی میں جا کر شامل ہو گئے ہیں اور اب دنیا بھر کو گالیاں دیتے پھرتے ہیں۔ کیا پتہ کی بات فرمائی ہے محترم نے کہ نہ آج

ٹولی مولیٰ ان بے چاروں کا دل توڑتیں۔ اور نہ یہ کمیونسٹ بنتے۔ تعجب سے سامراجیوں
 کو اب تک محترمہ کی دریافت کا کیوں پتہ نہیں چلا اور نہ وہ انھیں ضرور فقیر ہند
 کا خطاب عطا فرمادیتے۔ اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ کمیونسٹ بنانے کی کلیں یہ
 حسینا میں ہیں تو بجائے گولی اور لاٹھی چارج میں وقت برباد کرنے کے ایک
 قانون تحفظ عاشقاں پاس کر دیں جس کی رو سے کسی مہربین کو کسی عاشق کا دل
 توڑنے کا حق نہ رہے۔ نہ دل ٹوٹیں گے نہ کمیونسٹ پیدا ہوں گے اور جو یہ
 اے دن جلیں بھرتی جا رہی، بھوک پھیل رہی ہے، ہڑتالیں ہو رہی ہیں آپ
 ہی آپ ختم ہو جائیں گی اور سرکار کی قوم کی خادماؤں کے لئے بیٹھ کے لیو۔ کھپن
 اور ہوا باز فٹ تیار کرنا شروع کر دے گی۔ بھلا جب ملک کے نوجوانوں کو معلوم
 ہو گا کہ ذوقی، پوم پوم اور فی فی کمیونسٹوں کو پسند نہیں فرماتیں تو وہ فوراً اس
 پیشے سے تائب ہو جائیں گے، آج کل ہر ملک کی سامراجی طاقتیں ان کمیونسٹوں
 کے ہاتھ لگنی کا ناچ ناچ رہی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ محترمہ کی یہ دریافت ایٹم بم
 کا رتبہ حاصل کر جائے اور انھیں بین الاقوامی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں۔
 یہ نہیں تو کم از کم انھیں کمیونسٹوں کے اوپر کچڑا چھالنے میں سامراجیوں
 کا ہاتھ بٹلنے کے عوض کچھ تو انعام ملنا ہی چاہیے حالانکہ جہاں تک عوام کے فیصلہ کا
 سوال ہے یہ حرم خالی جائے گا۔ اگر آپ ان سے جا کر کہیں کہ یہ تمہارے نمائندے
 ہم مقدس سچائیوں پر زبردستی عاشق ہو جاتے ہیں، اور اگر ہم انھیں بڑھا کر اکٹھے
 کمانے والوں سے شادیاں کر لیں تو یہ جل کر تم سے جاتے ہیں اور انھیں ہمارے
 خلاف بھڑکانے لگتے ہیں، تو وہ اُسے آپ کا بھاگتے وقت کا آخری پتھر سمجھ کر منہ

موڈلیں گے۔ انہیں اپنے نمائندوں کے چال چلن کی تصدیق کرنے کے لئے پورے پورے
ڈارنگ کے سرٹیفکیٹ کی قطعی ضرورت نہیں۔ وہ اتنے احمق نہیں جتنا آپ انہیں سمجھتی
ہیں۔ وہ اب اپنے دشمن کی بسا ند دور ہی سے سونگھ لیتے ہیں۔

اتنی بات یا درہے کہ کمیونسٹ جو چین، برما، انڈونیشیا اور ملنگانہ میں
سامراجیوں کے پھلے چھڑا رہے ہیں۔ یہ وہ آپ کے دربار میں مصاحبی کہنے والے گداگر
نہیں جو دولت کی کمی کو ترقی پسندی اور اشتراکیت کے بادل میں لپیٹ کر محبوبہ
کے قدموں میں ڈالتے تھے کیونکہ یہ وہ ہمارے تھامے زمانے کے کمیونسٹ ہیں
یہ قطعی رومینٹک اور رسیلے نہیں۔ نہایت چالاک تلخ زبان۔ لاشعری چارجے
یہ نہیں رکتے۔ گولی کو یہ خیال میں نہیں لاتے۔ مر کے یہ نہیں ختم ہوتے تو بھلا یہ مر
جبینوں کے سخروں کو خاطر میں کب لائیں گے۔ ٹولی مولی ہزار بار ان پر عاشق نہ
ہونے کی دھمکی دیں۔ ان کے کان پر جوں بھی نہ رینگے گی۔

ان کی محبوبہ وہ زوئی نہیں جو عجبی کے عشق میں ناکام ہو کر فتح کشمیر کے ارادے
سے تفریجاً ترادخیل دوڑ پڑتی ہے۔ بلکہ وہ زوئی ہے جو ملنگانہ میں اپنی زمین کے
ذرہ ذرہ کی خاطر اپنے محبوب کے دوش بدوش برمودہ ہی ہے جو کلکتہ میں سامراجی
گولیاں سینہ پر کھائے شرک پر خون میں نہا رہی ہے جو بمبئی میں اپنے پیاروں کو
بھوکا مرنے دیکھ کر لاکھوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں سینہ سپر ہو رہی ہے۔ وہ اور
ہی طبقہ ہے جو ڈی لاما اور سیوائے کے چکنے فرش کے تخیل ہی سے پھیل
پڑتا ہے۔

ایک بار پطرس نے میرے اوپر اعتراض کیا تھا کہ میں درمیانہ درجہ کی

عکاسی تو کر لیتی ہوں لیکن ڈرائنگ روم میں جا کر چوڑی بھول جاتی ہوں، مجھے
 بڑا دکھ ہوا تھا کہ لو بھی پطرس صاحب کو بھی پتہ چل گیا کہ میں ڈرائنگ روم کی مخلوق
 نہیں ہوں، لیکن اب شکر کرتی ہوں کہ اچھا ہوا۔ میری پھوپھیاں اور کثیر الاولاد
 باپ کو ڈرائنگ روم سجانے کی توفیق نہ ہوئی، ورنہ میرا واسطہ بھی ٹوٹو فون کے سوا
 کسی انسان سے نہ پڑتا۔ اور آج یہ درمیانہ طبقہ کے بھمیلوں سے بھی بے کار تھیلے
 میرا موضوع ہوتے۔ میں ان ہی پر مشر مندہ ہوں لیکن یہ درمیانہ طبقہ کھیل کھیل کر
 مزدور کی آغوش میں گر رہا ہے۔ اس طبقے کے سارے ادیب اگر فرار میں نہ ڈوب گئے
 تو ایک دن وہیں پہنچ جائیں گے۔

مگر قرۃ العین کے کردار اور ان کا رویہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ چار منگ
 لوگ سب کے سب ایک ہی فرم کے ڈھلے موئے ہیں۔ سب ہی تو مرغابیوں کے
 سکار برگنڈی، کیوٹیکس، رابرٹ ٹامیلو کے سلونے حسن، کارمن میرانڈا کے گالوں
 ایسٹر وکیم کی سڈول پنڈلیوں کے دیوانے معلوم ہوتے ہیں۔ عیسائی یتیم خانوں
 کی تعلیم جہاں ذوق شعری، ٹوئیکل ٹوئیکل لٹل اسٹار سے شروع ہو کر چارج آف
 دی لائٹ بریگیڈ پر ختم ہو جاتا ہے اور نثر کا مطالعہ باپ دادا کی بوسیدہ لائبریریوں
 میں ٹھونسٹی ہوئی چند پر اسرار جرمن، فرانسیسی، ترکی اور انگریزی کتابوں تک
 محدود نظر آتا ہے، ویسے بھی صورت شکل میں، چال ڈھال میں سب یکساں ہی نظر
 آتے ہیں۔ وہی خانوش بھیلوں جیسی نیلی آنکھیں، سنہری گھونگر والے بالوں کی مالک
 لڑکیاں اور سارے کے سارے گیلنٹ ہنڈ سم نوجوان۔ نہ کبھی کسی کو چچا نے گھر کیا
 نہ ٹامیفانڈ نے گنجایا۔ نہ کبھی کسی کے خون میں کمی پیدا ہوئی۔ سولے عشق کے کبھی کسی کو

کوئی روگ نہیں ستاتا۔ کبھی کوئی بے جوڑ دباؤں کا شکار نہ ہوتا کیونکہ ان کے بارے میں کوئی سنگڑا لولا پھٹکنے ہی نہ پاتا۔ ایک بار کسی نے کہا تھا کہ قرۃ العین کے یہاں حسنی لگاؤ کا ذکر نہیں ہوتا۔ عریانی نہیں ہوتی۔ ویسے تو، یہ بڑی اچھی بات ہے فحاشی کوئی فخر کی بات نہیں لیکن اس فضا کو جو ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے کس قسم کی گھٹن سمجھا جائے؟ لڑکوں اور لڑکیوں کے جھگڑتے ہیں مگر ایک عجیب قسم کی بے حسنی طاری رہتی ہے۔ حسنائیں بالکل حقوک کے مال کی طرح پرکھتی ہیں اور پرکھی جاتی ہیں۔ جان بھڑک سجا کر تانے کی پتلیاں خریدی جا رہی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کی ایکسپورٹ امپورٹ ہو رہی ہے جیسے وہاں منڈی کی تلاش میں سمجھوتے ہوتے ہیں بالکل اسی طرح پراسپیکٹس کی تلاش میں شادی بیاہ ہوتے ہیں۔ احساس حسنی کبھی کامر کے آٹے اور روٹی کی بوریوں والا احساس رہ گیا ہے۔ عشق میں جو بہت ہوا تو بے ہوش ہونے کو جی چاہتا ہے اور ناکامی کے بعد تراڑ ٹھیل روانگی ہو جاتی ہے۔

کردار نگاری کو پھوڑ کر اگر انداز سخریر کو دیکھا جائے تو اس میں انفرادیت اور انوکھا پن کافی موجود ہے، ہاں کبھی کبھی انگریزی کے بعض الفاظ بھونڈے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے خیالات اُلٹے سیدھے ایک دوسرے سے کچھ اس طرح دست و گریباں نظر آتے ہیں کہ جی گھبرانے لگتا ہے۔ اب نکتہ ابھرتا ہے اس کی موافقت اور مخالفت کے سارے نکات دوڑ کر ساتھ لپٹ جاتے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ "ہاں" کہہ رہی ہیں یا "نا"۔ صاف اور عقلمندی کی باتیں ایک سانس میں ایک ہی ارادے سے ابلا کرتی ہیں عام طور پر لکھنے والا ایک کردار چن لیتا ہے جو اس کے اپنے معیار پر پورا اتر سکے جس میں

وہ خود اپنی ہستی کو چھپا کر بھٹا دیتا ہے۔ وہ جو پڑھنے والے کو اپنے میں جذبے کے جگ بیتی کو آپ بیتی کی چاشنی بناتا ہے۔ یہ کردار کوئی خیالات کا ہیولا نہیں بلکہ حقیقت سے وابستہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرانے والا کردار ہوتا ہے۔ مگر مس حیدر کا ہر کردار کوئی نہ کوئی ایسی چھپووری حرکت کر بیٹھتا ہے کہ اسکی پوری تصویر میں ایک بے ہنگم سا کوہِ نکل آتا ہے۔ ویسے آدے کا آدہ اسی کچھ حصے سے زیادہ چار منگاب۔ لیکن اس کے سوچنے میں بھی بانٹا کے جوتوں جیسی یکسانیت نظر آتی ہے۔ پڑھنے والے کو کچھ سوچنے اور سمجھنے میں مدد نہیں ملتی شاید اسی یکسانیت سے اکتا کر خود مصنفہ کبھی کبھی پڑھنے والے کو اچھال کر کسی بال روم یا ہوٹل میں رقص کے دو چار چکر دے دیتی ہیں۔ کبھی جوہی کی کلیاں ناک میں ٹھونس دیتی ہیں۔ کبھی ستاروں اور آبشاروں میں گھسیٹ لیجاتی ہیں۔

کرشن چندر کا کہنا ہے کہ ”وہ اب رقص گاہ کی روشنی کے ساتھ ساتھ باہر کا اندھیرا بھی دیکھنے لگی ہیں“ شرطیہ یہ انھوں نے نکلنا کہا ہے ایک ناقذ کی حیثیت سے نہیں لکھا کیونکہ فی فی، ششی ششی، اگر کبھی بھولے سے اندھیرے میں جاتی ہیں تو فوراً ٹو لڈر جیمسی اور شو شو کی برقی ٹارچ چاک اٹھتی ہے۔ اس لئے وہ اندھیرا کہیں نہیں دیکھتیں واصل انھوں نے اجالا کبھی نہیں دیکھا۔ ابھی تاک وہ فرحت گاہوں اور سرکسوں کی بقیعہ نور فضا میں ٹوٹ رہی ہیں۔ شمع زندگی کی لوائیوں نے نہیں دیکھی کہ کتنی بلند ہو چکی ہے۔ کیونکہ ان کے تخیل کے شیش محل کی بڑی موٹی موٹی دیواریں ہیں اور ہر روزن برہمن بہا ایرانی قالین منڈھے ہوئے ہیں۔ باقی سارے لوازمات برگر و جم چکی ہے یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین کے قلم کا سارا چلبلا پن اور ساری پھرتی ایکس گھٹے ہوئے ماحول میں بیدم نظر آتی ہے۔ نئی کھوپڑیوں میں وہی فرسودہ دماغ بجائے حسین اور

زندہ نفوس کھینچنے کے سرلیٹاک کیل بلو سچے بنانے پر مجبور کر رہا ہے۔ وہ دن دور
 نہیں جب مس حیدر بھی مس حجاب اسمعیل کی طرح ”مٹی“ اور ”لاشوں“ کے قصے لکھنے لگیں
 گی۔ ویسے گو اب بھی ان کے کردار کچھ کم حنوط کئے ہوئے نہیں ہوتے۔

سوال اٹھتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کرنے پر مجبور ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ
 دنیا ختم ہو رہی ہے۔ بڑی تیز رفتاری سے ختم ہو رہی ہے۔ اسپین، چین، انڈونیشیا
 کشمیر سب ختم ہو رہے ہیں۔ ”کیونکہ وہ سامراجیوں کے چٹل سے چھوٹے جا رہے ہیں۔
 بے شک ان کی دنیا مر رہی ہے۔ ختم ہو رہی ہے۔ چین میں سامراج دم توڑ چکا ہے
 اور باقی ممالک میں بھی پراسسک رہا ہے، ان کی انسانیت بڑے نازک دور سے
 گزر رہی ہے اور اب اگر ساری دنیا کی زو قیاں بھی امیبولنس لے کر دوڑ پڑیں تو
 اس لبِ دم مرہض کو نہ بچا سکیں گی۔ لیکن یہ بھی تو ممکن نہیں، انہیں خود اپنی باتوں
 پر یقین نہیں۔ ایک دوسرے پر یقین نہیں ”زندگی سے، ماضی سے مستقبل سے“
 اب آئیوری کے برج میں بیٹھ کر قنوطی باتیں کرنے سے بھی کام نہیں چلتا۔ ان کے لئے
 زندگی، موت ہی کا ایک حصہ ہے۔ ہر چیز کی آڑ میں کچھ نہ ہونے کا ہوا ڈرا رہا ہے
 اپنے انجام کے آثار، محلے ٹوٹے ہیں گرتی ہوئی دیواروں کے دھماکوں سے دکھائی دینے
 لگے ہیں۔ ”دنیا“ مر رہی ہے۔ دم گھٹ رہے ہیں۔

ویسے فساد کے زمانے میں تو اچھی خاصی گزر گئی۔ پرانی کو مٹی بند ہو کر سرخ
 قالینوں اور لکڑی کے گہواروں پر گرد جم گئی تو یہ لوگ مس کتوں کے ہوائی جہاز میں لدر
 نئے ملک میں قہوہ پینے اور خواب دیکھنے لگے۔ تو پھر یہ ہاے تو بہ یہ دہشت صرف اسی

طاقت کی ہو سکتی ہے جو اب انھیں بے دیکھے نظر آنے لگی ہے۔ نئی ذیلی عمر میں یہ احساسِ مردنی، یہ فرار اور یاسیت کیا معنی رکھتی ہے۔ شاید سرمایہ دار کی نئی پودھی گھٹی ہوئی پیدا ہو رہی۔ مردہ بن، فرار اور یاسیت کے جراثیم اسے ورثے ہی میں مل رہے ہیں۔ ”سب کچھ پا کر بھی کچھ نہیں کا احساس“..... ”دنیا فانی اور چند روزہ ہے۔“ ”زندگی کو کوئی معنی نہیں پہنچائے جاسکتے“ یہ سب کچھ ان کی ہڈیوں میں رچا ہوا ہے۔

بات یہ ہے کہ انھیں یہ معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ اب یہ چادر کسی پوینڈ پارے سے نہیں گونھتی جاسکتی۔ اس کی دھجیاں اڑ کر رہیں گی۔ کچھ تو یہ ”ڈولی مولی“ پھینا پھینا میں مسکا دیں گی، اور رہی سہی مارشل پلانوں، ڈالر اسکیموں اور سمجھوتوں کی لوٹ کھسوٹ میں تار تار ہو جائیں گے۔ بقول کسے :-

اپنے مرکز ہی سے ٹکراتا ہے زر کا پھیلاؤ

اور یہ دنیا کے ختم ہونے کا احساس وہ دوسروں کو بھی دلانا چاہتی ہیں۔ ویسے بات بچہ رومیننگ معلوم ہوتی ہے۔ مگر سمجھنے والوں کو نکتہ بھی کام کا مل جاتا ہے۔ ان لوگوں کا مقصد عوام کے دلوں میں یاسیت اور فرار پیدا کرنا ہے۔ کہ یہ زندگی فانی ہے۔ مارشل پلان بنتے ہیں تو بھائیوں بھاری بلا ہے، جینا ہی کتنے دن کا ہے۔ ڈالر کے جال پھیلے جا رہے ہیں تو کیا ہے۔ ہم تو دو گھڑی کے مہمان ہیں۔ کیا اس دور و زہ زندگی میں کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر عوام کے حقوق مانگتے ہو؟ یہاں تو زندگی بھی موت ہی کا اک حصہ ہے۔ ”کچھ عمرہ عمدہ مرنے کے طریقے بتائیں۔ آپس میں کٹ مرو۔ چاہو تو مذہب کا شوشہ اٹھا سکتے ہو، ملک اور قوم کا ڈھونگ رچالو۔ مگر

اپنے بچے کے دودھ کی فکر میں نہ گھلو۔ اپنی بیوی کی پھٹی ساری کی پرداہ نہ کرو۔ یہ قطعی غیر روحانی باتیں ہیں۔ غذا اور ستر پوشی کے علاوہ اور بھی تو ضروریات زندگی ہیں۔ جتنی کے پانچ اسپینل بھی تو ہیں۔ ان میں دلچسپی لو۔ ادھر دیکھو، غریب زوئی نامرادی کے مارے تراخیل و ڈری جا رہی ہے۔ کیونکہ جتنی ڈولی کا ہو گیا ہے کتنا ان رو مینٹاک ساتھ ہو گیا۔ یہ کیا بیکار کو الکشن گڑ بڑا کے اچھے بھلے انکل اور ڈیڑی کا ناطقہ بند کئے دے رہے ہو۔ اس کے بجائے اپنی روحوں کو فریہ کرو۔ شعور اور لاشعور کی گتھیموں کو سمجھو۔ "آؤ تمھیں" ستاروں سے آگے "خلا میں اُلٹا لٹکا دیں" وہاں کمیونسٹ پر نہیں مار سکتے۔

دیے بھی اس سے تو بہتر ہے کہ تم سب لیو کیٹین اور ہوا باز کیوں نہیں بنجاتے۔ کم سے کم چار کس بوئے یا رابرٹ ٹامپکس ہی بن جاؤ۔ تاکہ موتی ڈولی کے سہروں کے پھول بھی کھل جائیں۔ کب سے نگوڑیاں کا نوینٹ چھوڑے بیٹھی ہیں۔ گلابوں کی کمی کی وجہ سے مال گتھا کر لاشعور بو کھلائے جا رہے ہیں۔ اس طرح دنیا کی بے کاری بھی مٹ جائے گی۔ چپڑی اور دودو۔ کیا گڑ کی باتیں ہیں۔ مگر کوئی سمجھے جتنا کیا بے قدری ہے اس ملک میں ایشلک بھول گیا!

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ ساری بکو اس کرنے کے بعد میں مار کسی فلسفہ کی لمبی سی مشعل لے کر قرۃ العین کی رہنمائی کرنے چل پڑوں گی۔ اور ان سے کہو گی کہ "ابنی نئی اسٹوڈی بے کر جس میں آگے بھی شیشہ ہے اور پیچھے بھی" میں بیٹھ کر وہ بھنگی کو لوتی میں چلی جائیں اور ان کے ساتھ رہ کر ان کے لئے عوامی ادب تیار کرنے لگیں۔ جی نہیں۔ اڈل تو عوام کو مصنفوں کی مدد کی ضرورت نہیں، اگر ساری عمر

بھی ہم شہنشاہوں کے سہرے اور مرثیے لکھتے رہیں تب بھی عوام کی جہد و جہد کہ نقصان نہیں پہنچ سکے گا۔ انقلاب کی جنگ صرف مزدوروں اور کسانوں کی جنگ ہے۔ ہم مصنفین کی حیثیت اس بحر بے کراں میں ایک چلو سے زیادہ نہیں۔ ممکن ہی ہماری پالیسی ان کی فتح میں چند گھنٹوں کا فرق ڈال سکے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اب یہ ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اپنے چند گھنٹے کس پارٹی کو دیں۔ گرتے ہوئے سامراج کو یا اٹھتے ہوئے عوامی جذبے کو۔ انھیں ایک گھنٹہ زیادہ جلائیں یا ان کی شکل جلد از جلد آسان کر کے عوام کی فتح کی تاجیز کو مٹائیں۔ ہمارے اس فیصلہ پر ہمارے فن اور اسکی بقا کا انحصار ہے۔

اس کے علاوہ عوام کی مدد کرنے کا یہی طریقہ نہیں کہ ہم اوٹ پٹانگ، بغیر جانے بوجھے، ان کے بارے میں لکھنا شروع کر دیں۔ وہ جو واقعی عوام میں جذبہ ہو کر ان کے بن سکتے ہیں تو کیا کہنے۔ لیکن وہ جن کی وسعتیں محدود ہیں اور وہ درمیانہ طبقے سے ہی زیادہ قریب ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے طبقے کی صرف عکاسی ہی نہ کریں بلکہ اپنے فن کی مدد سے ان کے خاکوں میں جاذبِ نظر رنگ آمیزی سے صحت بخش نظریہ پیش کریں۔ انھیں مزدور طبقے سے روشناس کر کے قریب تر لائیں۔ ان کی فضول قدروں کی حماقت اور صحیح قدروں کی حوصلہ ریزیوں کو اجاگر کرنے میں مدد دیں اس لئے قرۃ العین کا فرض ہے کہ وہ کم از کم اپنے طبقے ہی کی ایمانداری سے ایسی عکاسی کریں اور ان میں ایسے رنگ بھریں جو ان کی آنکھوں کا جواب بن سکیں۔ اُلٹے پیدھے فوٹو اتارنے کے بجائے ایسے رنگین مرقعے تیار کریں جنہیں دیکھ کر زندگی اور پوم پوم سوچیں اور سمجھیں کہ انھیں کیا اور کیسے کرنا ہے۔ کم از کم یہی بتائیں کہ پہلے چاریاں

کن متفکندوں کے ذریعے شادی کے بازار میں کامیاب چھپنا جھپٹی کریں کہ
 ”بیچاری عورت کچھ تو کم ٹریجک مخلوق بن سکے“ یہ کیا کہ ایک طرف وہ کمیونسٹوں
 اور ان کے ارادوں سے ناراض ہیں، دوسری طرف لوگوں کے دل میں ہراس اور
 ”کچھ نہیں“ کا احساس شدت سے پیدا کرنا چاہتی ہیں۔

مگر یہ میں نے غلط لے دی۔ اس طبقہ کو سدھارنے کی کوشش اتنی ہی
 فضول ہے جتنی سینڈکوں کو اڑنا سکھانے کی۔ یہ پود تو بے بال و پر لند منڈ ہی
 پیدا ہو رہی ہے۔ دق تیسرے درجے کو پہنچ چکی ہے۔ اب تو وقت دوا اور دعا
 دونوں نکل چکے۔ یہ تو اب یوں ہی دماغی اور روحانی شعور اور لاشعور کے مرضوں
 میں گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔ اب تو بہتر یہی ہے کہ قرۃ العین ان کی مٹی عزیز کرانے
 میں جو کچھ بھی مدد کر سکتی ہیں کر ڈالیں تو اب ملیگا۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ان
 عقابوں کے ٹکیلے پنجنوں پر سان رکھی جائے جو اس لب دم مریض پر چھپٹے مار رہے
 ہیں اور کوئی دم میں تکا بوٹی کیا چاہتے ہیں۔ چلتے چلتے اتنا کہ بغیر نہیں رہا جاتا
 کہ ہمیں قرۃ العین کے قلم سے ایک لگاؤ ہے عجیب قسم کا پیار ہے جسے جھٹکتے وقت
 وہی پرانی رسمی ٹیسیں اٹھتی ہیں اور جی جاتے ہیں کاش ان کی پوم پوم ڈارلنگ ایک
 بار ان موٹے موٹے ایرانی قالینوں کو دور پھینک کر ادھ مرے چار منگ لوگوں کو
 بھول کر چل پڑے..... مثلاً بیبی..... پھر یہاں اس کو ایک کامریڈ مل جائے
 جو اپنے آئیڈیاز کے لئے دنیا سے لڑ کر میدان میں آیا، پھر وہ اس سے شادی کرے
 تو جیومی زونی کی محبت اسے مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں
 رہنے لگے۔ مگر کا خرچ پورا کرنے کیلئے کسی اسکول یا اخبار کے دفتر میں نوکری کر لے

اور شام کو دوستوں میں بیٹھ کر سوشلزم بگھارے اور ان کے لئے کافی تیار کرے۔
 بخدا کافی بنانا ان چار منگ بوروں سے مغز پچی کرنے سے ہزار درجہ زیادہ سہل اور
 دلچسپ مشغلہ ہے اور پھر جب اس کے بچے کا باپ شاعر یا ادیب ہونے کے جرم میں
 نامعلوم میعاد کے لئے جیل میں ڈال دیا جائے تو ہر مہفتہ سننے بچے کو گوہر میں لے کر
 اس سے ملنے جائے۔ خدا نے چاہا تو پرانے جراثیم مرجائیں گے۔ ٹوٹی ٹوٹی اور
 جیمی کے پانچ غیر جانبدار کتوں کی جدائی شاق نہ گزرے گی۔ ایک فلاڈر کو پھوڑ کر
 دوسرے کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ اپنے پرانے خول سے
 نفرت بھی نہ رہے گی۔ صرف کبھی کبھی پھریری آجائے گی۔

"کچھ بھی نہیں" مٹ کر "بہت کچھ جنم لے گا۔ جمی ہوئی گرد جھڑ جائے گی
 اور مردہ زندگی میں پل پل جاگ اٹھے گی سارے واہ کہیں بیسویں صدی میں بھی
 معجزے ہو سکتے ہیں !!!

جرّیں

سب کے ہرے نق تھے گھر میں کھانا بھی نہ پکا تھا۔ آج چھٹا روز تھا۔
 بچے اسکول چھوڑے گھروں میں بیٹھے اپنی اور سارے گھر والوں کی زندگی و بال کئے
 مے رہے تھے۔ وہی مار کٹائی و معمول وھیپا، وہی اودھم اور قلا بازیاں جیسے ہر گت
 آیا ہی نہ ہو۔ کمبختوں کو یہ بھی خیال نہیں کہ انگریز چلے گئے اور چلتے چلتے ایسا گہرا گھاؤ
 مار گئے جو برسوں سے گا۔ ہندستان پر عمل جراحی کچھ ایسے لہجے ہاتھوں اور گھٹل
 نشروں سے ہوا ہے کہ ہزاروں شریانیں کٹ گئی ہیں۔ خون کی ندیاں بہہ رہی
 ہیں۔ کسی میں اتنی سکت نہیں کہ ٹانگہ لگا سکے۔

کوئی اور معمولی دن نہ تھا تو کمبختوں سے کہا جاتا باہر کا لامنہ کر کے غدر مچاؤ
 لیکن چند روز سے شہر کی فضا ایسی غلیظ ہو رہی تھی کہ شہر کے سارے مسلمان ایک طرح
 سے نظر بند بیٹھے تھے۔ گھروں میں تالے پٹے تھے اور باہر پولیس کا پہرا تھا۔ لہذا
 کیلجے کے ٹکڑوں کو سینے پر کوڑا لٹکانے کے لئے بھوڑو یا گیا۔ ویسے سول لائن میں امن
 ہی تھا جیسا کہ عام طور پر رہتا ہے یہ تو گندگی و میں زیادہ اچھلتی ہے جہاں چہ بچے

ہوتے ہیں۔ جہاں غربت ہوتی ہے۔ وہیں جہالت کے گھورے پر نام نہاد مذہب کے ڈھیر بججاتے ہیں اور یہ ڈھیر کریدے جا چکے ہوتے۔ ادھر سے پنجاب سے آنے والوں کی دن بدن بڑھتی ہوئی تعداد اقلیت کے دل میں دہشت بٹھا رہی تھی۔ غلاظت کے ڈھیر تیزی سے کریدے جا رہے تھے اور عفونت، نیکی، نیکی صاف ستھری سڑکوں پر بہو سچ چلی تھی۔ دو چار جگہ تو کھلم کھلا مظاہر بھی ہوئے لیکن مارواڑ کی ریاستوں کے ہندو مسلمان کی اس قدر ملتیں جلتی معاشرت ہے کہ انھیں نام صورت یا لباس سے بھی باہر والے مشکل سے پہچان سکتے ہیں۔ باہر والے اقلیت کے لوگ جو آسانی سے پہچانے جاسکتے تھے وہ تو پندرہ اگست کی بو پا کر ہی پاکستان کی حدود میں کھسک گئے تھے رہے ریاست کے قدیم باشندے تو نہ ہی ان میں اتنی سمجھ اور نہ ہی ان کی اتنی حیثیت کہ پاکستان اور ہندستان کا دقیق مسئلہ انھیں کوئی بیٹھ کر سمجھاتا جنھیں سمجھنا تھا وہ سمجھ چکے تھے اور وہ مھنڈا ہو چکے تھے، باقی جو یہ سن کر گئے تھے کہ چار سیر کا گیہوں اور چار آنے کی ہاتھ بھر لمبی نان پاؤ ملتے ہے وہ لوٹے تھے، کیونکہ وہاں جا کر انھیں یہ بھی پتہ چلا کہ چار سیر کا گیہوں خریدنے کے لئے ایک روپیہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ہاتھ بھر لمبی نان پاؤ کے لئے پوری چوٹی دینا پڑتی ہے اور یہ روپیہ اٹھنیاں نہ ہی کسی دوکان پر ملیں اور نہ کھیتوں میں اُگیں۔ انھیں حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا زندہ رہنے کی تگ و دو۔

لہذا جب کھلم کھلا علاقوں سے اقلیت کو نکالنے کی رائے ہوئی تو بڑی

مشکل آن پڑی۔ ٹھاکروں نے صاف کہہ دیا کہ صاحب رعایا ایسی گنتی ملی رہتی ہو
مسلمانوں کو بین کر نکلنے کے لئے باقاعدہ اسٹاف کی ضرورت ہے جو کہ بیکار
نائد خراج ہے ویسے آپ اگر کوئی ٹکڑے زمین کے شرنا رتھیوں کے لئے
خریدنا چاہیں تو وہ خالی کر آئے جاسکتے ہیں۔ جانور تو رہتے ہی ہیں جب کہ
جنگل خالی کرادیا جائے۔

اب باقی رہ گئے چند گنے چنے خاندان۔ جو یا تو مہاراجہ کے چلیے چانٹوں
میں سے تھے اور جن کے جلنے کا سوال نہ تھا یا وہ جو جانے کو تلے بیٹھے تھے۔ بس ستر
بندہ رہے تھے۔ ہمارے خاندان بھی اسی فہرست میں آتا تھا۔ جب تک بڑے جہلی
اجمیر سے نہ آئے تھے کچھ ایسی جدی نہ تھی مگر انھوں نے تو اگر بوکھلا ہی دیا۔ پھر
بھی کسی نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ وہ تو شاید کسی کے کان پر جوں نہ رنگتی اور
برسوں اسباب نہ بندھ چکے جو اللہ بھلا کرے چھبیا میاں کا وہ پنیتر نہ
چلتے۔ بڑے بھائی تو جانے ہی والے تھے کہ کہہ کر ہار گئے تھے۔ تو میان چھبیا
نے کیا کیا کہ ایک دم اسکول کی دیوار پر ”پاکستان زندہ باد لکھنے کا فیصلہ کر لیا
روپ چند جی کے بچوں نے اس کی مخالفت کی اور فوراً بگاڑ کر ”اکھنڈ ہندستان“
لکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ جل گیا جو تا اور ایک دوسرے ہی کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی سعی
فرمائی گئی، بات بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ پولیس بلائی گئی اور جو چند گنتی کے مسلمان بچے
تھے۔ انھیں لاری میں بھر کر گھروں کو بھجوا دیا گیا۔

اب سینے کہ جوں ہی بچے گھر میں آئے ہمیشہ ہینہ طاعون کے سپرد
کرنے والی مائیں۔ ماما سے بے قرار ہو کر دوڑیں، اور انھیں کھجے سے لکالیا گیا

اور کوئی دن ہوتا اور روپ چند جی کے بچوں سے چھبڑ کر آتا تو وطن بھابی اس کی وہ جوتیوں سے مرہم سی کر تیں کہ توبہ بھلی اور اٹھا کر انھیں روپ چند جی کے پاس بھیج دیا جاتا کہ پلائے اُسے انڈی کا تیل اور کوئین مکسچر کیونکہ روپ چند جی ہمارے خاندانی ڈاکٹر ہی نہیں ابائے کے پرانے دوست تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی دوستی ابائے سے۔ ان کے بیٹوں کی بھائیوں سے۔ بہوؤں کی ہماری بھانجیوں سے۔ اور نئی پود کی نئی پود سے آپس میں دانت کاٹی روٹی تھتی۔ دونوں خاندانوں کی موجودہ تین پیڑھیاں ایک دوسرے سے ایسی گھلی ملی تھیں کہ شہد بھی نہ تھا کہ ہندستان کی تقسیم کے بعد اس محبت میں کھوٹ پڑ جائے گی۔ حالانکہ دونوں خاندانوں میں مسلم لیگی کانگریسی اور مہاسبھائی موجود تھے اور مذہبی اور سیاسی بحثیں بھی جم جم کر ہوتیں مگر ایسے ہی جیسے فٹ بال یا کرکٹ میچ ہوتے ہیں۔ ادھر ابائے کانگریسی تھے تو ادھر ڈاکٹر صاحب اور بڑے بھائی لیگی تھے، تو ادھر گیان چند مہاسبھائی ادھر مچھلے بھائی کمیونسٹ تھے تو ادھر گلاب چند سوشلسٹ۔ اور پھر اسی حساب سے مردوں کی بیویاں اور بچے بھی اسی پارٹی کے تھے۔ عام طور پر جب مچھلے ہوتا تو کانگریس کا پلہ بھاری پڑتا۔ کمیونسٹ سوشلسٹ بھی گالیاں کھاتے، مگر کانگریس ہی میں گھس پڑتے۔ رہ جاتے مہاسبھائی اور لیگی یہ دونوں ہمیشہ ساتھ دیتے۔ گو وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوتے۔ پھر بھی دونوں مل کر کانگریس پر حملہ کرتے۔ لیکن ادھر کچھ سال سے مسلم لیگ کا زور بڑھتا گیا اور ادھر مہاسبھائی کا۔ کانگریس کا تو بالکل پٹا ہو گیا۔ بڑے بھائی کی سپاہ سالاری میں گھر کی ساری نئی پود سوائے دو ایک غیر جانب دار قسم کے کانگریسیوں کو چھوڑ کر منشیل گارڈ کی طرح ڈٹ گئی

اور گریان چند کی سرداری میں سیوک سنگھ کا چھوٹا سادل ڈٹ گیا۔ مگر دوستی اور محبت میں فتور نہ آیا۔

”اپنے لٹو کی شادی تو متی ہی سے کروں گا“ مہا سبھائی گیان چند متی کے لیگی باپ سے کہتے ”سونے کی پازیب لاؤں گا“

”یار لمح کی نہ ٹھوک دینا“ یعنی بڑے بھائی گیان چند کی ساہوکاری پر حملہ کرتے ہیں۔

ادرا دھرمیشل گارڈ دیواروں پر پاکستان زندہ باد لکھ دیتے اور سیوا سنگھ کا دل اسے بگاڑ کر اکھنڈ ہندستان لکھ دیتا۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب پاکستان کا لین دین ایک مہینے مہینے کا مشغلہ تھا۔

ابا اور روپ چند جی یہ سب کچھ سنتے اور مسکراتے اور سارے ایشیا کو ایک بنانے کے منصوبے باندھنے لگتے۔

اماں اور چاچی یاست سے دور دھینے ہلدی اور میٹوں کے جھینروں کی باتیں کیا کرتیں اور بہو میں ایک دوسرے کے فیشن چرانے کی تاک میں لگی رہتیں نمک مرچ کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کے یہاں سے دوا میں بھی منگوائی جاتی روز۔ کسی کو پھینک آئی اور دوڑا ڈاکٹر صاحب کے پاس یا جہاں کوئی بیمار ہوا اور اماں نے وال بھری روٹی یا دہی بڑے بنوانے شروع کئے اور ڈاکٹر صاحب سے کہلوادیا کہ کھانا ہو تو آجائیے۔ اب ڈاکٹر صاحب اپنے پوتوں کا ہاتھ پکڑے آن پہنچے۔

چلتے وقت بیوی کہتیں ”کھانا نہ کھانا سنا“

”ہوں تو پھر فیس کیسے وصول کروں۔ دیکھ جی لالہ اور چینی کو بھیج دینا“
 ”ہمارے رام بھتیجے تو لاج بھی نہیں آتی۔“ چاچی بڑ بڑا تیش۔ مزہ تو جب
 آتا جب کبھی اماں کی طبیعت خراب ہو جاتی۔ اماں کانپ جاتیں۔
 ”نا بھئی میں اس مسخرے سے علاج نہیں کراؤں گی۔“ مگر پھر گھر کے
 ڈاکٹر کو چھوڑ کر کون شہر سے بلانے جاتا۔ لہذا سنتے ہی ڈاکٹر صاحب دورے
 آتے۔

”اکیلی اکیلی پلاؤ زردے اڑاؤ گی تو آپ بیمار پڑو گی۔“ وہ جلاتے
 ”جیسے تم کھاؤ ہو ویسے ہی اوروں کو سمجھتے ہو۔“ اماں پردے کے پیچھے
 سے بھناتیں۔

”ارے یہ بیماری کا تو بہانہ ہے۔ بھابی تم ویسے ہی کہلو او یا کرو۔ میں
 آج یا کروں گا۔ یہ ڈھونگ کا ہے کو رہ جاتی ہو۔“ وہ آنکھوں میں شرارت جمع کر کے
 مسکراتے اور اماں جل کر لہجہ کھینچ لیتیں اور صلواتیں سناتیں۔ ابامسکرا کر
 رہ جاتے۔

ایک مریض کو دیکھنے آتے تو سارے گھر کے مرض اٹھ ٹکڑے ہوتے، کوئی
 اپنا پیٹ لئے چلا آ رہا ہے تو کسی کی پھنسی چھل گئی۔ کسی کا کان پک رہا ہے تو کسی
 کی ناک سو جی ہوئی ہے۔

”کیا مصیبت ہے ڈپٹی صاحب! ایک آدھ کو زہر دے دوں گا۔ کیا مجھے
 سلوتری سمجھا ہے کہ دنیا بھر کے جانور ٹوٹ پڑے۔“ وہ مریضوں کو دیکھتے جاتے
 اور بڑ بڑاتے جاتے۔

اور جہاں کوئی نئے بچے کی آمد کی اطلاع ہوتی۔ وہ جلد سامانِ تخلیق کو گالیاں دینے لگتے۔

”ہنہ مفت کا ڈاکٹر ہے۔ پیدا کئے جاؤ کمبخت کے سینے پر کو دوں دلنے کے لئے۔“

مگر جوں ہی در و شروع ہوتا وہ اپنے برآمدے سے ہمارے برآمدے کے چکر کاٹنے لگتے۔ چیخ چنگھاٹ سے سب کو بوکھلا دیتے۔ محلے بڑے والیوں کا آنا و سوار، ہنہ والے باپ کے آتے جاتے تڑا تڑا چپتیں اور جرأتِ احمقانہ پر بھپکارس۔

پر جوں ہی بچے کی پہلی آواز ان کے کان میں پہنچتی وہ برآمدے سے دروازے پر اور دروازے سے کمرے کے اندر آ جاتے اور ان کے ساتھ ساتھ آتا بھی باولے ہو کر آ جاتے۔ غور میں کوستی پلٹی پردے میں ہو جاتیں، زچہ کی ہنسن دیکھ کر وہ اس کی پیٹھ ٹھونکتے ”واہ میری شیرنی!“ اور بچے کا نال کاٹ کر نہلانا شروع کر دیتے۔ والد صاحب گھبرا گھبرا کر پھو ہڑزس کا کام انجام دیتے پھر اماں چلانا شروع کر دیتیں۔

”وہ غضب خدا کا۔ یہ مردوئے ہیں کہ زچا خانے میں پلے پڑتے ہیں۔“ اور معاملہ کی نزاکت کو محسوس کر کے دونوں ڈانٹ کھائے ہوئے بچوں کی طرح بھاگتے باہر۔

اور پھر جب آبا کے اوپر فالج کا حملہ ہوا تو روپ چند جی ہاسپٹل سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے اور ان کی ساری پرمیکش، ان کے اور ہمارے گھر تک محدود

رہ گئی تھی۔ علاج تو اور بھی کئی ڈاکٹر کر رہے تھے مگر نرس کے اور اماں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ہی جاگتے اور جس وقت سے وہ ابا کو دفنا کر آئے حنا مذاقی محبت کے علاوہ انھیں ذمہ داری کا بھی احساس ہو گیا۔ بچوں کی فیس معاف کرنے، اسکول دوڑے جانے۔ لڑکیوں بالیوں کے جینز کے لئے گیان چند کا طبقہ بند رکھتے۔ گھر کا کوئی خاص کام بغیر ڈاکٹر صاحب کی رے کے نہ ہوتا۔ پچھپی بازو کوڑا کر جب دو مکرے بڑھلنے کا سوال اٹھا تو ڈاکٹر صاحب ہی کی رے سے دبا دیا گیا۔

”اس سے تو اوپر دو مکرے بڑھوا لو“ انھوں نے رے دی۔ اور اس پر عمل ہوا۔ محنت ایف اے میں سائنس لینے کو تیار نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب جوتا لے کر پل پڑے، معاملہ طے ہو گیا۔ فریدہ میاں سے لڑکر گھر آن بیٹھی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس اس کا میاں پہنچا اور دوسرے دن اس کی منجھلی بہو شلابیہ بیاہ کر آئی تو دائی کا جھگڑا بھی ختم ہو گیا۔ بیچاری ہسپتال سے بھاگی آئی۔ فیس تو دور کی چیز ہے اوپر سے چھٹے دن کرتا ٹوپی لے کر آتی۔

پر آج جب چھتا لڑ کر آئے تو ان کی ایسی آؤ بھگت ہوئی جیسے مرو غاری میدان مار کر آیا ہے۔ سب نے ہی اس کی بہادری کی تفصیل پوچھی اور بہت سی زبانوں کے آگے صرف اماں کی زبان گنگ رہی۔ آج سے نہیں وہ پندرہ گست سے جب ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ترنگا جھنڈا اور اپنے گھر پر لیگ کا جھنڈا لگا تھا اسی دن سے ان کی زبان کو چپ لگ گئی تھی۔ ان دو جھنڈوں کے درمیان میلوں لمبی جوڑی خلیج حائل ہو گئی۔ جس کی بھیانک گہرائی کو وہ اپنی غمگین آنکھوں سے

دیکھ دیکھ کر لرزا کر تیں۔ پھر مشرنا رہتیوں کا غلبہ ہوا۔ بڑی بھوکے میکے والے
 بھاول پور سے مال لٹا کر اور بہ مشکل جان بچا کر جب آئے تو خلیج کا دل نہ چوڑا
 ہو گیا۔ پھر راول پنڈی سے جب نر ملا کے سسرال والے نیم مروہ حالت میں
 آئے تو اس خلیج میں اڑھے پھسکا ریں مارنے لگے۔ جب چھوٹی بھابی نے
 اپنے بچے کا پیٹ دکھانے کو بھیجا تو شیدا بھابی نے جلدی سے نوکر کو بھگا دیا۔
 اور کسی نے بھی اس معاملے پر بحث مباحثہ نہیں کیا۔ سارے گھر کے
 مرض ایک دم رک گئے۔ بڑی بھابی تو اپنے ہسٹریا کے دوسے بھول کر لپا جھپ
 اسباب باندھنے لگیں۔

”میرے رنک کو ہاتھ لگانا“ اماں کی زبان آہ کو کھلی اور سب
 ہکا بکا رہ گئے۔

”کیا آپ نہیں جائیں گی؟“ بڑے بھیا ترشی سے بولے۔

”نوج موئی میں بندھنوں میں مرنے جاؤں۔ اللہ ماریاں۔ برکے پا جائے
 پھر کاتی پھریں ہیں۔“

”تو سنبھلے کے پاس ڈھاکہ چلی جائیے۔“

”اے وہ ڈھاکہ کا ہے کو جائیں گی۔ کہیں کی مونڈی کاٹے بنگالی تو چاول
 ہاتھوں سے لیٹر لیٹر کے کھاویں ہیں۔“ سنبھلے کی ساس ممانی بی نے طنز دیا
 ”تو راولپنڈی چلو فریدہ کے یہاں“ خالہ بولیں۔

”تو بہ میری“ اللہ پاک پنجا بیوں کے ہاتھوں کسی کی مسیٰ پید نہ کر لے
 مٹ گئی دوزخیوں کی تو زبان بولے ہیں“ آج تو میری کم سخن اماں پٹاپٹ

بول چلیں :-

”اے بوا تمھاری تو وہی مثل ہو گئی کہ اُدبچے کہ نیچے بھیرے کے پٹر تلے
بیٹی بیتر گھرنہ جانو۔ اے بی یہ کٹو گھری کی طرح غمزہ مستیاں کہ بادشاہ نے بلایا۔ توہی
بھم بھم کرتا..... ہاتھی بھیجا کہ چاک چاک یہ تو کالا کالا کہ گھوڑا بھیجا چاک چاک
یہ تو لاتیں بھاڑے کہ.....“

باد جو دکھ فضا مکدر سی تھی پھر بھی فتنہ پڑ گیا۔ میری اماں کا منہ اور
پھول گیا۔

”کیا بچوں کی سی باتیں ہو رہی ہیں“ نیشنل گارڈ کے سردار اعلیٰ بولے
”جن کا سر نہ پیر کیا ارادہ ہے۔ یہاں رہ کر کٹ مریں؟“
”تم لوگ جاؤ، اب میں کہاں جاؤں گی۔ میرا آخری وقت۔“
”تو آخری وقت میں کافروں سے گت بنواؤ گی؟“ خالد بی پوٹلیاں
گنتی جاتی ہیں اور پوٹلیوں میں سے سونے چاندی کے زیور سے لے کر ہڈیوں
کا منجن، سوکھی میٹھی اور ملتانی مٹی تک تھتی۔ ان چیزوں کو وہ ایسے کلجے سے
لگا کر لے جا رہی تھیں گویا پاکستان کا اسٹرنگ بلینس کم ہو جائے گا۔ تین دفعہ
بڑے بھائی نے جل کر ان کی پرانے روہڑ کی پوٹلیاں پھینکیں پر وہ ایسی چٹھاڑیں
گویا یہ دولت نہ گئی تو پاکستان غریب ہو جائے گا۔ اور مجبوراً بچوں کے موت
میں ڈوبی ہوئی گدیوں کی روٹی کے پلندے باندھنے پڑے۔ برتن بوروں
میں بھرے گئے۔ پلنگوں کی پائے پٹیاں کھول کر جھلنگوں میں باندھی گئیں اور
دیکھتے ہی دیکھتے جاجا یا گھر ٹیڑھی میڑھی گھڑیوں اور بچوں میں تبدیل ہو گیا۔

تو سامان کے پر لگ گئے ہیں اور قلائیں بھرتا پھرتا ہے۔ ذرا ستانے کو بیٹھا ہے اور پھر اٹھ کر ناپچنے لگے گا۔

پر اماں کا ٹرنگ جوں کا توں رکھا رہا۔

”آپ کا ارادہ یہاں مرنے کا ہے تو کون روک سکتا ہے۔“ بھائی صاحب

نے آخر میں کہا۔

اور میری معصوم صورت کی بھولی سی اماں بھٹکتی آنکھوں سے گدے آسمان کو تکتی رہیں، جیسے وہ خود اپنے آپ سے پوچھتی ہوں کون مار ڈالے گا؟ اور کب؟

”اماں تو سٹھیا گئی ہیں۔ اس عمر میں عقل بھگانے نہیں۔“ منجھلے بھائی کان میں کھپسائے۔

”کیا معلوم انھیں کہ کافروں نے معصوموں پر تو اور ظلم ڈھائے ہیں۔ اپنا وطن ہوگا تو جان و مال کا تو اطمینان رہے گا۔“

اگر میری کم سخن اماں کی زبان تیز ہوتی تو وہ ضرور کہتیں ”اپنا وطن ہے کس چڑیا کا نام؟ لوگو! بتاؤ تو وہ ہے کہاں اپنا وطن جس مٹی میں جنم لیا جس میں لوٹ پوٹ کر بڑھے پلے، وہی اپنا وطن نہ ہوا تو پھر کہاں چاروں کو جا کر بس جاؤ وہ کیسے اپنا وطن ہو جائے گا اور پھر کون جانے دہاں سے بھی کوئی نکال دے۔ کہے جاؤ نیا وطن بساؤ۔ اب یہاں چراغ سحری بنی بیٹھی ہوں، ایک ننھا سا جھونکا آیا اور وطن کا جھگڑا ختم۔ اور یہ وطن اجاڑنے اور بسانے کا کھیل کچھ دھچپی بھی تو نہیں ایک دن تھا مغل اپنا وطن چھوڑ کر نیا وطن بسانے آئے تھے۔ آج پھر چلو وطن بسانے

وطن نہ ہوا پیر کی جوتی ہو گئی، ذرا تنگ پڑی اتار پھینکی، دوسری پہن لی۔ مگر وہ خاموش رہیں اور ان کا چہرہ پہلے سے زیادہ تھکا ہوا معلوم ہونے لگا جیسے وہ صدیوں سے وطن کی کھوج میں خاک چھاننے کے بعد تھک کر آن بیٹھی ہوں اور اس تلاش میں خود کو بھی کھو چکی ہوں۔

سر آئے پیر گئے۔ مگر اماں اپنی جگہ پر ایسے جمی رہیں جیسے بڑے کے پیر کی جرٹ آندھی طوفان میں کھڑی رہتی ہے۔

پر جب بیٹے بیٹیاں ہوئیں، داماد، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں پورا کا پورا قافلہ بڑے بچانک سے نکل کر پولیس کی نگرانی میں لاریوں میں سوار ہونے لگا تو ان کے کلیجے کے ٹکڑے اڑنے لگے۔ بے چین نظروں سے انھوں نے خلیج کے اس پار سبکیسی سے دیکھا۔ سڑک بیچ کا گھراؤ اور لگا جیسے دور افق پر کوئی سرگرداں بادل کا لکڑہ روپ چند جی کا برآمدہ سسٹن پڑا تھا۔ دو ایک بار بچے باہر نکلے مگر لمبے پکڑ کر واپس گھسیٹ بیٹے گئے۔ پر اماں کی آنسو بھری آنکھوں نے ان آنکھوں کو دیکھ لیا جو دروازوں کی جھریوں اور چھتوں کے سچھے منناک ہو رہی تھیں۔ جب لاریاں دھول اڑا کر قافلے کو لے سدھاریں تو ایک بائیں طرف کی مردہ حس نے سانس لی، دروازہ کھلا اور بو بھل قدموں سے روپ چند جی چوروں کی طرح سامنے کے خالی ڈھنڈھار گھر کو تاکتے نکلے اور کھوڑی دیر تک غبار کے بگوڑے میں بچھڑی ہوئی صورتوں کو ڈھونڈتے رہے اور پھر ان کی ناکام نگاہیں مجرمانہ انداز میں، اجرٹے دیار میں بھٹکتی ہوئی واپس زمین میں دھنس گئیں۔

جب ساری عمر کی پوچھی کو خدا کے رحم و کرم کے حوالے کر کے اماں دھنڈھا

صحن میں آکر کھڑی ہوئی تو ان کا بوڑھا دل ننھے بچے کی طرح سہم کر کھلا گیا جیسے چاروں طرف سے بھوت آن کر انہیں دبوچ لیں گے۔ چکر اکر انہوں نے اچھے کا سہارا لیا۔ سامنے نظر اٹھی تو کلیجہ اچھل کر منہ کو آیا۔ یہی تو وہ مکرہ تھا جسے دولہا کی پیار بھری گود میں لانگ کر آئی تھیں۔ یہیں تو کمسن خوفزدہ آنکھوں والی بھولی سی دھن کے چاند سے چہرے پر سے گھونگھٹ اٹھا۔ زندگی بھر کی غلامی لکھی تھی۔ وہ سامنے بازو کے کمرے میں پہلو تھی کی بیٹی پیدا ہوئی تھی اور بڑی بیٹی کی یاد ایک دم سے ہوک بن کر کلیجے میں کو زد گئی، وہ کونے میں اس کا نال گر رہا تھا۔ ایک نہیں دس نال گرے تھے اور دس روحوں نے یہیں پہلی سانس لی تھی۔ دس گوشت و پوست کی سورتوں نے، دس انسانوں نے اسی مقدس کمرے میں جنم لیا تھا۔ اس مقدس کوکھ سے جسے آج وہ چھوڑ کر چلے گئے تھے جیسے وہ پرانی کچلی تھی جیسے کانٹوں میں الجھا کر وہ سب سٹاٹ نکلے چلے گئے۔ امن اور سکون کی تلاش میں۔ روپیہ کے ۴ سیر گہیوں کے پیچھے اور وہ ننھی ننھی ہستیوں کی پیاری آغوں آغوں سے مکرہ اب تاک گونج رہا تھا۔ لپک کر وہ کمرے میں گود پھیل کر دوڑ گئیں، پھر ان کی گود خالی تھی وہ گود جسے سہاگینیں تقدس سے چھو کر ہاتھ کوکھ کو لگاتی تھیں، آج خالی تھی۔ مکرہ پڑا بھائی بھائی کر رہا تھا۔ دہشت زدہ ہو کر وہ لوٹ پڑیں مگر چھپے ہوئے تختیل کے قدم نہ ٹوٹا سکیں۔ وہ دوسرے کمرے میں لڑکھڑا گئے۔ یہیں تو زندگی کے ساتھی نے سچا سیرس کے تباہ کے بعد منہ موڑا تھا۔ یہیں دروازے کے سامنے کھنائی ہوئی لاش رکھی تھی۔ سارا کنبہ گھیرے کھڑا تھا۔ خوش نصیب تھے وہ جو اپنے پیاروں کی گود میں سدھارے پر زندگی کی ساتھی کو چھوڑ گئے جو

اُن جے کفنائی ہوئی لاش کی طرح لاوارث پڑی رہ گئی۔ پیروں نے جواب دے دیا اور وہیں بیٹھ گئیں جہاں میت کے سر ہلنے دس برس ان کی کیا تے ہاتھوں نے چراغ جلایا تھا۔ پر آج چراغ میں تیل نہ تھا اور جتنی بھی ختم ہو چکی تھی۔

اور سامنے روپ چند اپنے برآمدے میں زور زور سے ہٹل رہے تھے گالیاں دے رہے تھے۔ اپنے بیوی بچوں کو، نوکروں کو۔ سرکار کو اور سامنے بھیلی ہوئی بے زبان سڑک کو، اینٹ پتھر کو اور چاقو چھری کو۔ حتیٰ کہ پوری کائنات ان کی گالیوں کی بمباری کے آگے سہمی دہکی بیٹھتی تھی۔ اور خاص طور پر اس خالی گھر کو جو سڑک کے اس پار کھڑا ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ جیسے خود انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی اینٹ سے اینٹ، ٹکرا دی ہو، وہ کوئی چیز اپنے دماغ میں سے جھٹک دینا چاہتے تھے۔ ساری قوتوں کی مدد سے نوچ کر پھینک دینا چاہتے تھے مگر ناکام سے جھنجھلا اٹھتے تھے۔ کینہ کی جڑوں کی طرح جو چیز ان کے وجود میں جم چکی تھی وہ اسے پوری طاقت سے کھینچ رہے تھے۔ مگر ساتھ ساتھ جیسے ان کا گوشت کھینچتا چلا آتا ہو، وہ کراہ کر چھوڑ دیتے تھے۔ پھر ایک دم ان کی گالیاں بند ہو گئیں، ہٹل ختم گئی اور وہ موڑ میں بیٹھ کر چل دیے۔

رات کو جب گلی کے نگر پرنسٹاٹ چھا گیا تو پچھلے دروازے سے روپ چند کی بیوی دو پر دسی ہوئی تھا لیاں اوپر نیچے دھرے چوروں کی طرح داخل ہوئیں۔ دونوں بوڑھی عورتیں خاموش ایک دوسرے کے آگے سامنے بیٹھ گئیں۔ زبانیں بند رہیں پر آنکھیں اب کچھ کہہ سُن رہی تھیں۔ دونوں مقالیوں کا کھانا جوں کا توں رکھا تھا۔ عورتیں جب کسی کی غیبت کرتی ہیں تو ان کی زبانیں کترنی کی طرح

چل نکلتی ہیں۔ پر جہاں جذبات نے حملہ کیا اور منہ میں تباہ پڑ گئے۔

رات بھر نہ جانے کتنی دیر پریشانیاں اکیلا پا کر شبخون مارتی ہیں۔ نہ جانے رستے ہی میں تو سب نہ ختم ہو جائیں گے۔ آج کل تو اکا دکا نہیں پوری پوری ریلیں کٹ رہی ہیں۔ سچا سب برس خون سے سینچ کر کھیتی تیار کی اور آج وہ دلیں نکالا لے کر نئی زمین کی تلاش میں افتاں و خیزاں چل پڑی تھیں۔ کون جانے نئی زمین ان پودوں کو اس آئے نہ آئے۔ کھلا تو نہ جائیں گے۔ یہ غریب الوطن پودے! چھوٹی بہو تو اللہ دیکھے ان گناہینہ ہے۔ نہ جانے کس جنگل میں زچہ خانہ بنے۔ گھر بار نوکری، بیویاں سب کچھ چھوڑ کر چل پڑے ہیں۔ نئے وطن میں چل کوؤں نے کچھ چھوڑا بھی ہو گا۔ یا یہ منہ تکتے ہی لوٹ آئیں گے اور جو لوٹ کر آئیں گے اور جو لوٹ کر آئے تو پھر سے جڑیں پکڑنے کا بھی موقع ملے گا یا نہیں۔ کون جانے یہ بوڑھا ٹھونٹ بہار کے لوٹ آنے تک زندہ بھی رہے گا کہ نہیں۔

گھنٹوں سٹرن باولیوں کی طرح دیوار پاکھوں سے لپٹ لپٹ کر نہ جانے کیا بکیتی رہیں پھر شل ہو کر پڑ گئیں۔ نیند کہاں؟ ساری رات بوڑھا جسم جو ان بیٹیوں کی کٹی پھٹی لاشیں، نو عمر ہوؤں کے برہنہ جلوس اور پوتوں نواسوں کے چتھڑے اڑتے دیکھ دیکھ کر تھرا تار ہا۔ نہ جانے کب غفلت نے حملہ کر دیا۔

کہ ایک دم ایسا معلوم ہوا دروازے پر دنیا بھر کا عذر ڈھے پڑا ہے۔ جان پیاری نہ سہی پر بنا تیل کا دیا بھی بجھتے وقت کانپ تو اٹھتا ہی ہے اور پھر سیدھی سادی موت ہی کیلئے رحم ہوتی ہے جو اوپر سے وہ انسان کا بھوت بن کر آئے۔ سنا ہے بڑھئیوں تک کو بال پکڑ کر سڑکوں پر گھسیٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھال چھل

کر ہڈیاں جھلک آتی ہیں اور پھر وہیں دنیا کے وہ عذاب نازل ہوتے ہیں جن کے خیال سے دوزخ کے فرشتے بھی زرد پڑ جائیں۔

دستک کی گھن گرج بڑھتی جا رہی تھی۔ ملک الموت کو جلدی پڑی تھی نا اور پھر آپ سے آپ ساری چٹنیاں کھل گئیں۔ بتیاں جل اٹھیں جیسے دور کنوئیں کی تہ سے کسی کی آواز آئی۔ شاید بڑا لڑکا پکار رہا تھا۔ — نہیں یہ تو چھوٹے اور سنبھلے کی آواز تھی۔ دوسری دنیا کے معدوم سے کونے سے۔

تو مل گیا سب کو وطن؟ اتنی جلدی؟ سنبھلا اس کے پیچھے چھوٹا۔ صاف تو کھڑے تھے، گودوں میں بچوں کو اٹھائے ہوئے۔ پھر ایک دم سے سارا گھر جی اٹھا۔ ساری روئیں جاگ اٹھیں اور دکھیااری ماں کے گرد جمع ہو گئیں چھوٹے بڑے ہاتھ پیار سے چھونے لگے۔ ایک دم سے خشک ہونٹھ میں ننھی ننھی کو نیلیں پھوٹ نکلیں، دفر مسرت سے سارے حواس تتر بتر ہو کر تاریکی میں بھنور ڈالتے ڈوب گئے۔

جب آنکھ کھلی تو نبض پر جانی پہچانی انگلیاں رینگ رہی تھیں۔
 ”ارے بھابی مجھے ویسے ہی بلا لیا کرو چلا آؤں گا یہ ڈھونگ کا ہے کو رچاتی ہو۔“ روپ چند جی پردے کے پیچھے سے کہہ رہے تھے۔

”اور بھابی آج تو فیس دلوادو، دیکھو تمہارے نالائق لڑکوں کو توئی جنکشن سے پکڑ کر لایا ہوں۔ بھاگے جانے تھے بد معاش کہیں کے۔ پولس سپرنٹنڈنٹ کا بھی اعتبار نہیں کرتے تھے۔“

پھر بوڑھے ہونٹ میں کو نیلیں پھوٹ نکلیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ

گئییں۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر دو گرم گرم موتی لٹھک کر روپ
چند جی کے جھریوں دار ہاتھ پر گر پڑے۔

کہ بیٹا ہی ہوگا۔ پیر ہی ایسا پڑتا تھا بندو کی دھن کا ————— سبھی اس کی
 دین تو نہ ہاتھ دیکھے نہ پاؤں ————— نو مہینے پا پڑ میلے ————— اب پھر
 جھارٹو پھری لوندیا ————— ” پڑ دسن بڑ بڑالی کہ اتنے میں زحلی دالے
 گھر سے سڑ پڑ دوڑنے اور دبی گھٹی ہائے توبہ کی آواز نے پڑ دسنوں کو اپنی
 کھڑی چار پائیاں اور سینوں سے لٹکتے ہوئے بچے پھوڑ کر دیواروں پر چڑھ
 جانے پر مجبور کر دیا۔

دیوار کے اس پار صفت ماتم بھچی ہوئی تھی۔ دہلیز پر بند درمیاں
 کی ماں پھسکڑا مارے بیٹھی نکمی بہو کی سات پشت کو گالیاں دے وہی تھیں
 ”موئی ہیمچڑوں کے خاندان کی ————— لوندیا نہ جنے گی تو اور کیا کرے
 گی۔“

صحیحی کے سامنے پڑی ہوئی کھاٹ پر بند درمیاں سر کپڑے ایسے
 میٹھے تھے جانو ڈاکو ان کے گھر میں کوئل پھوڑ کر درائے ہیں اور ان کی نو
 مہینے کی جمع پونجی کو آگ لگا کر ایک راکھ کا ڈھیر بنا گئے ہیں۔ یہ تیسرا گھاؤ تھا
 ان کی جان حزیں پر۔ ایک سہا ————— دوسرا سہا ————— پر اس تیسرے
 چر کے نے تو ان کی کمر دہری کر دی۔ ایک نہیں تین بیٹیاں ایسی دھسی
 ہوئی چھاتی پر تین پہاڑ ————— تین بارائیں ————— تین دولہاؤں کے
 سو خنرے ————— تین بہیروں کے تین ہزار طنطنے جیسے تین لمبی ناگین
 ان کی گردن کی طرف زبانیں پھیلاتی بڑھی چلی آ رہی ہوں۔ رہ رہ کر ایک
 دبی ہوئی خواہش بھن اٹھاتی کہ ایک بار جی کڑا کر کے ان تینوں ناگینوں کا گلا

گھونٹ ڈالیں۔

جب پہلی بار یہی سانحہ ہوا تھا تو وہ کچھ کھپا کر رہ گئے تھے۔ یار لوگوں نے پھبتیاں کسی تھیں سو بھی کر ڈوی مسکراہٹ میں چھپا گئے تھے۔ دو چار غنا میتیں جو بیٹے کی آس پر بوی کے لئے بطور انعام اکٹھا کر رکھی تھیں وہ گول کر گئے۔ مگر پھر اس مزدور کی طرح جو ایک کنواں کھودے۔ زمین کے کلیجے میں ہاتھ ڈال کر چلو بھر پانی اٹھائے اور وہ کھاری نکل جائے تو کلی کر کے پھر دوسرے کنوئیں کی داغ بیل ڈال دیتا ہے۔ — انھوں نے بھی نہایت بے صبری سے داغ بیل ڈال دی۔ — ایک نئے ارمانوں کا نیا بیج بو ڈالا۔

اور یہ نیا بیج اس بار پھر اٹاگ گیا۔ بہتیرا جھنجھلائے۔ گالیاں، گھونسنے، لات، سب ہی کچھ استعمال کیا اور پھر ہمت بھی نہ ہاری۔ اللہ کا بندہ کوشش پر آمادہ ہو گیا کہ اب کے تو جان توڑ کر ایک ایسا بیج بو ڈالے جس کے تناور تنے سے پیٹھ لگا کر زندگی کی بھاگ دوڑ میں ایک گھڑی کو سستا سکے جس کی گھنیری چھاؤں میں ایک بار تھکے ماندے پیر پھیلا سکے۔ آخر دنیا میں کچھ تھوڑا سا سہارا کچھ تھوڑی سی چھاؤں اس کے حصے کی بھی تو تھی مگر نہیں اس کے نصیب میں تو بس کانٹوں بھری جھاڑیاں ہی تھیں۔ ایک نہیں تین تین۔

”ارے اپنے رسول اللہ کی بھی تو بیٹیاں ہی تھیں۔ جنتی ہوتا ہی بیٹیوں کا باپ۔“ لوگوں نے چاہا بندو میاں کے زخموں پر ذرا فردوس بریں کی مقدس ہواؤں کے پھانے رکھیں۔ شاید کچھ حورانِ بہشتی کی عنبریں

زلفوں کا خیال مشام جاں کو فرحت بخشے۔ زمرہ کے محلوں کی جگہ گاہٹ اس کے کچے مکان کی غلاظتوں کو ڈھاگ سکے۔ — دودھ اور شہد کی نہروں کا تصور شاید اس تلخی کو زائل کر سکے۔ جو بوسیدہ اناج۔ بدبودار تیل اور باسی ترکاریوں کی عنایت سے حلق میں۔ مغل و کنجاب کے خواب ان گھسے پھسے چیتھروں میں ر فوکر سکے۔ ویسے بھی اسد پاک اپنے پیارے بندوں کو دنیا میں دکھ پہنچا کر ان کا امتحان لیا کرتا ہے۔ پتہ نہیں۔ اسے اس قسم کی امتحان بازی میں کیا لذت ملتی ہے۔ کاش ان احمقانہ باتوں میں پڑنے کے عوض وہ جی لگا کر خدائی کرتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل اس پیشے سے اکتا چکا ہے اور اسے بھی کڑے امتحان لینے — مصیبت جھلوانے — اور اپنے لاڈلے بندوں کو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز پل صراط پر منت بازی کروانے کا چیکا پڑ گیا ہے۔

مگر بندو میاں اس وقت رات کے تین بجے جبکہ ایک عدولرٹ کی ان پر قسمت نے اور داغ دی تھی جنتی بننے کو بالکل تیار نہ تھے۔ حور ان بہشتی کی صورت سے انھیں قے آرہی تھی کیوں کہ وہ اس جنس کے ہاتھوں بے طرح تلے گئے تھے۔ جب ایک کالی دہلی اور بے بس لڑکی ہی ان کے کسے پر نہ چل سکی اور ایک ٹوٹا پھوٹا لونڈا بھی پیدا نہ کر سکی تو بھلا وہ خنر ملی حوریں اس کا کلیجہ کیا ٹھنڈا کر سکیں گی۔ دودھ اور شہد کی نہریں ان تین ننھے مٹے حلقوں کو جو ان کے چاروں طرف منہ بھاڑے گھوم رہے ہیں

بھلا کیا تر کر سکیں۔ وہ اچھی طرح جان گئے تھے کہ یا قوت اور زمرہ کے محل
قطعی ان کے ہاتھ نہ آسکیں گے۔ وہاں بھی یہی دھاندلی ہوگی۔ بڑی بھاری
بگڑی ہوگی جو ان کے باپ سے بھی نہ بھری جالے گی۔

اور تاریک کوٹھری کے سب سے تاریک کونے میں ملزمہ اپنی سوجی
ہوئی آنکھوں سے ان تینوں پہاڑوں کو دیکھ رہی تھیں، انہیں اپنے رحم
میں اپنی ممتا کی چھاؤں میں پروان چڑھایا تھا، ان میں اپنی جوانی کا گرم گرم
خون سچوڑا تھا۔۔۔۔۔ تین بار اس نے اپنے تئیں بھاڑ کر ایک نیا انسان
جانتا تھا تین بار خود کو مٹا کر پھر سے بنایا تھا۔

پر نہ جانے کون سی چوک ہو گئی کہ ہر بار پھل کڑوا ہو گیا۔۔۔۔۔ ہر بار
نوالہ کیچڑ میں گر پڑا۔۔۔۔۔ اور پھر سیاہ لالٹین کی دھندلی روشنی میں اس
نے تین پہاڑوں کو اپنی چھاتی کی طرف پھسلتے دیکھا اور ہچکیوں سے اس کا کھٹکا
ہوا جسم ٹٹنے لگا۔ کڑوے کڑوے آنسو اس کے زخمی مونٹوں پر تیزاب
کی طرح چھیننے لگے۔۔۔۔۔ کبھیلن کا درد پیچ و تاب کھا کر اٹھا اور جسم کے دکھوں
نے ذہنی دکھوں کو پرے ڈھکیل دیا۔ یہ پیدائش کے بعد کی ٹیس دروزہ
سے کچھ کم نہیں ہوتیں۔

جب درد کا چکر دھیمہ پڑا تو اسے بے اختیار پہلوٹھی کا پہلا درد
یا دوا گیا۔ وہ عجیب قسم کا جتیا جاگتا درد جس کی جس کی ننھا منہ مان تار کے
ذریعے سے اطلاع بھیجتا ہے جسے وصول کرتے ہی اس پر خوف و مسرت کے
وہ عجیب و غریب جذبات طاری ہو گئے تھے، جن کی کوئی تشریح نہیں۔

جن کو کسی دیکھ کسی مکھ یا کسی دوسرے احساس سے تشبیہ نہیں دیا جاسکتی
 جو صرف ایک ماں کی سزا — ماں کا انعام اور ایک ماں کی دولت ہے۔
 مگر وہ بڑی نادان تھیں۔ پہلے ہی درپردہ پر بیٹے کو گود میں لینے لگی
 — چشم زدن میں اسے چھپاتی سے لگا بھی لیا — گھر شادیوں
 سے گونج اٹھا۔ شہدوں نے محلہ سر پر اٹھایا۔ مہترانیاں لہک لہک کر گانے
 لگیں۔ اور وہ دھن بن کر منہ سے دوٹھا کو گود میں سنبھالے۔ صحن میں تارے
 دیکھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے انگن میں جھنڈو لٹا چم چم کھیلنے لگا۔ دادی دادا
 کے بوڑھے دل جاگ اٹھے — تو وہ چوڑی چھپاتی کا جوان اکھٹے
 میں کود پڑا — میں بھیگیں — مونچھوں کا کونڈا ہوا —
 — اے لودیوانہ پن تو دیکھو مسلمانیاں بھول ہی گئی — توبہ —
 اگر درد کا منہ زور حملہ کیا یک نہ ہو جاتا تو وہ پہلے اس مقدس فرض
 سے سبکدوش ہو جاتی۔ خیر جب لہریں ساحل سے دور ہٹیں تو اشرکھے
 سب کام کاج پورے ہو چکے تھے۔ اور اب کماؤ پوت روپوں کی تھیلی جھٹکاتا
 داییز ناگھ رہا تھا۔ کھن کھن کرتے گول گول چاندی کے ٹکڑے سارے گھر
 میں ٹھنکنے لگے۔ دو چار پھدک کر بوڑھی دادی کی جھولی میں بھی جا پڑے۔ دو
 چار اچک کر دادا کی داڑھی میں بھی ستاروں کی طرح ٹٹمانے لگے۔ واہ یہ خوب
 ٹکھ بھریں بی فاختہ اور کوٹے اندھے کھامیں۔ ماں کا حق پہلے —
 درودوں کا معاوضہ پہلے — گوشت پوست کی قیمت پہلے اور وہ
 لمبے لمبے ہاتھ مار کر کھیتی کا ٹٹی ہی رہتی کہ درودوں نے تو چل میں آیا شروع کر دیا۔

گنتی کی چند سالوں کے درمیان اس نے سوچا کہ کما دپوت کے لئے ہو بیاہ کر لائے یا نہیں؟ کیونکہ ہو آگئی تو ڈال ادھر ہی جھکنے لگے گی پھل ادھر ہی زیادہ ٹکیں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہو لانے کا فیصلہ کرتی

———— ارٹاڑ ڈھم ——— بیٹی آگئی۔ کھن کھن کرتے سارے روہلی ستارے چوہے بن کر بوں میں گھس گئے۔ روپوں کی پھیلی لوٹ پوٹ کر خالی ٹھیکرا بن گئی۔

دادا کی سفید ڈارھی پر اس پر لگئی اور دادی کے ارمانوں کا شیرازہ ہوا میں اڑ گیا۔ والی مائی موٹی موٹی گائیاں عورت ذات کے جنم میں تھوکنے لگی اس کا بس چلتا تو وہ ایک سرے سے عورت کی پیدائش کا گلا ہی گھونٹ دیتی اس کا بیج ہی دنیا سے مٹا دیتی۔ اشرامی رات کے تین بجے اور پھر خاک پڑی اور نصیبوں جلی نوٹ دیا ——— اور پھر نصیبوں جلی نوٹ دیا ——— اور پھر نصیبوں جلی نوٹ دیا۔

پھر نہ جانے ایک دم سے اس کے جی میں نہ جانے کیوں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ گھیلین کا درد و غم و غصہ کے ہاؤ میں بہ گیا۔ غروب سے اس نے تنکے پر سر کر سر اودنچا کر لیا۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ——— وہ ہاتھ نہیں، بنجر نہیں۔ پھر یہ ادا سہی کیوں۔ اس نے کس کی جاگیر چھین لی۔ کس کی دولت چھین لی ——— جس کا اسے یہ خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے گائے بیاتی ہے تو کوئی نہیں پوچھتا، بیٹی ہے کہ بیٹا۔ سب دودھ دوتے ہیں لگتے ہیں۔ مرغی اندا دیتی ہے تو اسے پیار سے دانہ ڈالتے ہیں۔ پر جب عورت

حاملہ ہوتی ہے تو لوگ اس سے سونے کا انڈا دینے کی کیوں فرمائش کرتے ہیں؟ اور اگر وہ سونے کا انڈا نہ دے سکے تو — تو گھر میں موت ہو جاتی ہے۔ امیدوں، آرزوؤں کے جنازے اٹھنے لگتے ہیں اور دنیا غریب ہو جاتی ہے۔

پھر اسے اپنے تینوں گندے بے مصرف انڈوں کا خیال ستانے لگا۔ بے اختیار جی بھر آیا اور آنکھوں میں دھواں اٹھنے لگا۔ جی چاہا کہ اپنے تینوں کلیجے کے ٹکڑوں کو اٹھا کر اس گھر سے، اس گلی سے — اس شہر سے بلکہ اس دنیا سے بھاگ جائے۔ وہاں، جہاں اس کے جگر گوشے دولت کی ترازو میں نہ تو لے جائیں جہاں سب سونے کے انڈے ہوں — کوئی گندے انڈے کی خندق میں نہ ڈالا جائے۔ جہاں اس کی ننھی گڑیاں جائز و اشتاؤں کی خدمت انجام دینے کے بدلے عورت، ماں بیٹی اور بیوی کا رتبہ حاصل کر سکیں۔ جہاں عورت کی تخلیق عذابِ جان نہ ہو۔ جہاں لڑکیوں کی برائتیں بھوت بن کر ماں باپ کے سینوں پر نہ چڑھتی ہوں، جہاں بیٹیوں کا جہیز ماں باپ کی کھال نہ اُتارے۔ جہاں اولاد سے والدین محبت کریں۔ اولاد سمجھ کر زر جاگیر سمجھ کر نہیں۔

اس کا جی چاہا لپک کر اٹھ بیٹھے اور باہر جا کر سوگ منانے والے میاں کا منہ نونچ ڈالے اور اسے جھنجھوڑ کر کہے "تمہیں غم ہے۔ صدمہ ہی کہ میں نے تمہارے بیج سے کٹیلا جھاڑا گایا۔ مگر غور سے دیکھو۔ کیا یہ تمہاری ہڈی نہیں۔ تم ڈر رہے ہو کہ تمہیں اس کی سچائی تو کرنا پڑے گی مگر پھل نہ

ملیں گے۔ آج اگر بیٹا بیٹی کے بدلے سونے کے توڑے جن دیتی تو تم یوں
منہ سچا کر کبھی نہ بیٹھتے۔

مگراتے میں اس نے دیکھا کہ ایک بھیا نک سایہ اس کے پناگ
کی طرف بڑھ رہا ہے۔ خوف سے اس کی رگیں کھینچنے لگیں۔ آواز گلے میں
گھٹ کر رہ گئی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتی، بندوبستیاں نوزائیدہ
بچی پر جھباک گئے۔

”شوکتِ حشمت — اور اس کا نام — رحمت“
گیوں بھیاک ہے نا؟ انھوں نے بچی کے پھول سے نرم رخسار کو انگلی سے
چھوا اور مسکرانے لگے۔ آج نہ ان کے چہرے پر کھیاں پن تھا اور نہ
آنکھوں میں ملامت۔ نہ ان کے انداز میں از سر نو پیغام تھا نہ بھوئی
امیدوں کے غیر مطمئن سایے۔ جیسے وہ بہت کچھ سوچ سمجھ کر کسی بڑے
دشمن سے جیت کر آئے ہیں۔

روہنسی ماں نے عزور سے شوکتِ حشمت اور رحمت کو دیکھا
دنیا کی ماؤں کو دیکھا — ان پہاڑوں کو دیکھا جن کے دامن میں زندگی
کی ہریالیاں انگریزی لیتی ہیں۔ جن کے آنچلوں میں مہر و الفت کے
پھول کھلتے ہیں۔ جن کے سینوں سے امرت ٹپکتا ہے۔ جن کی
گودوں میں علم و حکمت ہمکتا ہے — فلسفہ آغوں بھرتا ہے
اور فنون لطیفہ کلکاریاں مارتے ہیں۔ جہاں بسورتی زندگی چمکاری
جاتی ہے اور سوئی انسانیت جگائی جاتی ہے — اُچاٹ

نیند میں منائی جاتی ہیں۔ روتی آنکھیں ہنسائی جاتی ہیں اور بکھرے
 موتی سمیٹے جاتے ہیں۔ — دنیا بنتی بگڑتی ہے —
 یہاں انسان ڈھلتے ہیں۔

کچے دھاگے

آج گاندھی جینتی ہے۔ شہر میں کتنی جہل پھیل رہی ہے۔ پھولوں اور ترنگے جھنڈوں سے آناستہ پیراستہ موٹر میں اپنی آغوش میں نود و لیتے سیٹھوں کو دیئے فرٹے بھر رہی ہیں ہون جیسی سفید کھدر میں یہ آبنوس پتلے کالے سفید کا جکیرا ملاپ آنکھوں پر کیسی تکلیف دہ چوٹ کرتا ہے۔ اور ان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی بد ذوق سیٹھانیاں اور غل مچاتے ہوئے بچے مٹونے پر سہاگہ "کا کام کر رہے ہیں۔ دولت بنا کے سنے ان پر لوٹ پڑی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کپڑے پہنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ بہت سے بے ہنگم نقان کسی نے اٹھا کر موٹر میں ٹھونس دیے ہیں۔ سامان آرائش رنگ و پودر، الماریوں سے کو کر ان پر آن پڑا ہے۔ ناک بہتے تیل میں چھپاتے بچے ڈائٹ اوے کی الرٹ موٹر ن فراکوں کے ساتھ جب جھانکھن کر پڑے پہنے آنکھوں میں منوں کا جل اُنڈیلے عجیب مضحکہ خیز مٹی بنے ہوئے ہیں۔ ہاتھوں میں ترنگے جھنڈے ہیں اور امریکن کھلونے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کسی سستے مگر

کا اشتہار چلا جا رہا ہے۔

آج باپو کا جنم دن ہے نا۔ آج بھارت کے سپوت نے بھارت نواسیوں کو غلامی سے آزاد کرنے کے لئے دھرتی پر پہلا سانس لیا تھا۔ مگر پرل اور لال باغ کی چالوں میں یہ کیسی مردنی بھائی ہوئی ہے جیسے آج ان کا کوئی نہ پیدا ہوا ہو، بلکہ ہزاروں موتیں ہو گئی ہوں۔ لاکھوں امیدیں دھواں بن گئی ہوں۔ ان کے چہروں کی رونق کہاں غائب ہو گئی ہے کیا یہ کبھی واپس نہ آئے گی؟ ان کے کپڑوں میں رنگ کیوں نہیں طلوع کی چمک کیوں نہیں ان کے ہاتھوں میں ترنگے غنائے کیوں نہیں؟ باپو تو جنتا کے تھے۔ پھر یہ چور بازایوں ہی کہتے کیوں چڑھ گئے۔

جیسے پرانے زمانے کے دیوتاؤں کو پھین لیا تھا، ایسے ہی انھیں بھی لوگ اڑا لے گئے اور شوکیں میں سجا دیا۔ بخوریوں پر منڈھ دیا..... لین دیں کی ترازو کے پڑے میں بنگھری بنا کر ڈال دیا ہے۔ انھیں مسٹھائی اور سبکٹ کے ڈبوں پر چمکا دیا ہے۔ جوتوں کے اشتہار پر ٹانگ دیا ہے۔ ان کا نام لے کر چندے جمع کرتے ہیں۔ ان کا نام لے کر ہڑتالیں توڑتے ہیں، انھیں کا بہانہ کر کے کنٹرول ہٹاتے ہیں اور کالے بازار کو سیختے ہیں۔ ان کے بنا کوئی دھندہ نہیں چلتا۔ جانورپ کا اکاٹھ آگیا ہے، ہر داؤ پر وہی لگھا دیتے ہیں اب شاید انھیں کے نام پر اھنسا کے ہولوں پر نیسری جنگ کا خون چھڑکا جائے گا۔

آج اھنسا دادی ان کی یاد میں آتما کو شدھ کرنے کے لئے سوت کات رہے ہیں۔ بڑے بڑے منسٹر چوٹی کے افسر، ملوں کے مالک سسٹے اور چور بازاروں کے بیوپاری، ایک محاذ پر اکٹھے ہو کر آتما کو شدھ کر رہے ہیں۔ دو سال کے عرصے

میں کتنی بہت سی آتمائیں ناپاک ہو چکی ہیں، ان کے لئے اس سوت کے تانے بانے سے ایک سا زبان بنا جائے گا جس کی چھپاؤں میں پختہ مٹھکر یہ پھلتے پھولتے رہیں گے۔

میرے ماموں جان بھی اپنے ڈرائنگ روم میں صوفہ پر نیم دراز صبح سے نکلی سجا رہے ہیں۔ ان کے چہرے پر کیا مقدس غم چھایا ہوا ہے، جانو پل صراط بن رہے ہیں جس پر چل کر انھیں سو رگ میں جاتا ہے۔ نہ جانے وہ اس کچے سوت کے پھندے سے کیا کچھ بچا لیں لینے کی تکریم لگا رہے ہیں۔

کبھی وہ برٹش سرکار کے فرزند و بلند رہ چکے تھے لیکن چونی کی طرح طوفان کی خبر پا کر جلدی سے نمک کی ستیہ گروہ میں کود پڑے اور نمک بنانے لگے۔ جب وہ یوں گمراہ ہوئے تو ان کے والد صاحب نے انھیں عاق نہیں کیا بلکہ بیٹے کی دانشوری کی داد دی۔ وہ خود سرکار سے وابستہ ہے مگر ان کا بیٹا باغی ہو گیا۔ جی بھی تو آج وہ دسی سرکار کی ناک کا بال بنے ہوئے ہیں۔ بیس سال محکمہ تعلیم کی اصلاح کرنے کے بعد وہ اب "کیمونسٹوں کو مارو" والی اسکیم میں بڑی شد و مد سے حصہ لینے کے قابل ہو گئے ہیں۔

نکلی سجاتے جاتے ہیں اور سوچ رہے ہیں۔ بھنگیوں کی ہڑتال طالب علموں کی مدد سے نہ ٹوٹ سکی۔ یہ وار خالی گیا۔ اب طالب علموں کی ہڑتالیں کس کی مدد سے ٹوٹوائی جائیں۔ تالی بجنے کے لئے دو ہاتھوں کا ہونا ضروری ہے۔ سر لڑانے کے لئے دوسروں کا ہونا ضروری ہے۔ کیا طالب علموں کے دو ٹکڑے نہیں کٹے جاسکتے؟ ماموں جان زہر کا توڑ زہری سے کرتے ہیں اس لئے طالب علموں کی ایک

صحیح نمائندہ جماعت کی پیداوار میں منہمک ہیں جو جی تو ذکر قومی گیت گانے
فیس بڑھانے پر سرکاری بے پناہ مہربانی کا شکر یہ ادا کرے اور کمیونسٹوں کے ہر کام
میں آکر ٹاک کا تختہ نہ اُٹے بس بھر ہڑتالیں بند ہو جائیں گی۔ ادھر تکلی نایچ رہی
ہے، ادھر وزیر اعظم پر دسیوں سے ناطہ جوڑائے ہیں، وہاں سے تحفہ
لامیں گے جس کی مدد سے بھوکے ساتھ ساتھ بھوکوں کا بھی صفایا ہو جائے گا۔

ادھر میرے نانا جان انھیں رشاک آمیز نظروں سے تاک رہے ہیں۔ وہ
صبح سے بیٹھے جو جھ رہے ہیں پر تکلی ان کے نکلے سے بل نکالے دے رہی ہے۔
روٹی کا ٹکڑا پسینہ میں ڈوب کر چوہے کی شکل کا ہو گیا ہے۔ تین تکلیاں بدل
چکے ہیں پر ہر نئی تکلی انھیں نیا نایچ سچا رہی ہے۔ وہ اکڑوں بھی بیٹھے پالتی بھی ماری
دو زانوں ہوئے پھر ماموں جان کی طرح نیم دراز بھی ہو گئے مگر ان کی طرح نرت
بھاؤ نہ جما سکے۔ کوئی تکلی بھی ماموں جان کی تکلی والا بھڑانا نہیں بھرتی۔

وہ جھنجھلاتے ہیں تب ماموں جان مسکراتے ہیں۔ جیسے آنکھوں ہی
آنکھوں میں کہہ رہے ہوں "قبلہ ریاض کی ضرورت ہے ریاض کی۔ یہ مرتبہ یوں
بلا تپسیا کئے ہاتھ نہیں لگ جایا کرتا۔ جہاد کے لئے تلوار پکڑنے کی آرزو مند انگلیاں
بھلا تکلی کو پکڑنا کیا جانیں۔ آپ ڈپ تفنگ کے عادی مھڑے، یہ روحانی تلوار
یعنی تکلی گھمانا کیا جانیں۔

میرے نانا جان ان کی آنکھوں کی بات چیت سمجھنے کے ایسے عادی
ہو چکے ہیں کہ فوراً ان کے گھٹنے لرزنے لگتے ہیں، ویسے ہی ان کی گھبراہٹیں
مالیخولیائی کی حدوں کو چھو رہی ہیں، جیسے شاہی کہ ہندستان اور پاکستان دونوں

جگہ ان کی تجارت کھنڈٹ میں بڑنے والی ہے بالکل ہی حواس باختہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا ایک پیر مہدستان میں ہے تو دوسرا پاکستان میں۔ یہاں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا واسطہ دیتے ہیں تو وہاں اسلام کی دہائی۔ پر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ نانا جان کی پیچ و پکار میں کوئی دم نہیں رہا دو دنوں ملک ایک دو سرے دور کھسکتے جا رہے ہیں اور ان کے ساتھ میرے نانا جان کے دونوں پیروں کے درمیان کا فاصلہ خطرناک حد تک دور ہوتا جا رہا ہے بچ میں سے جو جانے کا کرب ان کی رگ رگ میں رچ گیا ہے۔ دکھ اور خوف سے پھرائی ہوئی آنکھیں وہ گاندھی جی کے اس مجسمے کی طرف پھیر دیتے ہیں جو بنگلہ کے بچوں نے بچ نضب ہے۔ اور ہر آنے جانے والے کو جتا کر نانا جان وہاں روز پھول چڑھا کر دھڑا کرتے ہیں۔

ماموں جان پر انھیں رشک نہیں آتا۔ اب تو جادوگری کا بھی شہہ ہونے لگا ہے۔ وہ کسی دلیری سے بیٹھ کر افسردوں کے بچ میں وزیر اعظم پر چھینٹے بازی شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے بوکھلانے اور ایک دم بھرنے کے قصے سنا کر کیا مزے سے قہقہے لگاتے ہیں اور لگواتے ہیں۔ کانگریس ہمدیویوں کا تو بالکل گھر کی بڑی بوڑھیوں کی طرح ذکر کرتے ہیں۔

تو بالکل گدھا ہے، ایک ہمدیوی نے ایک بار میرے ماموں جان سے کہا تھا اور اس وقت انھیں اپنی خوش نصیبی پر فخر ہوا تھا اور آنکھوں میں مارے عقیدت کے آنسو ابل آئے تھے۔ اب بھی بعض موقعوں پر جب وہ قصہ سناتے ہیں تو انکی آنکھوں میں آنسو ابل آتے ہیں۔ نانا جان اس روحانی رشتے کی متبرک

لطافت پر جھوم جھوم اٹھتے ہیں، پر دکھ سے تلمل جاتے ہیں۔ کاش انہیں بھی کسی نے پیار میں گدھایا کتا کہا، موتا تو وہ آج کتنی بہت سی زحمتوں سے بچ گئے ہوتے۔ مگر ایک بار قائد اعظم کے جلوس کا اونٹ بننے کے بعد کسی اور اطمینان میں تو ان کے لئے جگہ ہی نہیں اور آج باپو کی جینتی کے موقع پر تھکی کے سخرے بڑے کھل رہے ہیں۔

وہ سوت کاتے جا رہے ہیں اور اس میں موٹی موٹی گالیاں پروتے جا رہے ہیں، مگر وہ جانتے ہیں یہ اڑیل سوت ان سے شرط باندھ کر مقابلہ کر رہا ہے مردیاں دیتے دیتے ان کی چٹکیاں ٹھک چکی ہیں۔ پودے سہلا رہے ہیں۔ پر سوت مجال ہے جو کمبخت دواپنچ سے آگے کھسک جائے جی تو وہ اس میں مغلظات کی گرہیں جڑتے جاتے ہیں۔ یہ سوت وہ عید الضحیٰ کے موقع پر وزیر اعظم کی گردن میں مالا بنا کر حمل کرنا چاہتے ہیں۔ بڑی کادشوں سے انھوں نے مسلمان محلوں میں لوگوں کو اونچ نیچ دکھا کر وزیر صاحب کو مدعو کرنے کا انتظام کیا ہے۔

جب کبھی تار ٹوٹتا ہے تو ان کا جی چاہتا ہے کہ ایک دم حج کو چلے جائیں اور وہاں در حضور پر بیٹھ کر انھیں بند کر کے ایک مستقل مراقبہ میں چلے جائیں۔ مگر ایک دم انھیں ہندستان اور پاکستان میں پھیلے ہوئے کاروبار کا خیال اس مراقبہ سے چوکھا دیتا ہے۔ اور وہ سہم کر چاروں طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں ماسون جان کا کوئی چھٹا سا تو ان احساس ان کے دل کا چور نہ پکڑے۔ نہیں تو سارے کدو دھڑے پر پانی پھر جائے گا۔

اپنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے ردی کی لچکی بھی کچھ تال سر سے

نہیں ناچ رہی ہے۔ چکریاں لیتے لیتے ایک دم سے توڑے لینے لگتی ہے اور پھرتیوہ اکہ تار بھی توڑ دیتی ہے مگر رڈی مل جی ہمت نہیں ہارتے۔ ملک میں بڑی افراطی پڑی ہے۔ جدھر دیکھو بے ایمانی، دھوکہ بازی، باپو کی تعلیم کو بھول کر سب لوٹ کھسوٹ پر تے ہوئے ہیں۔ ایسے میں کوئی ایسا مذاری کا بیوپار کرے تو کیسے کرے۔ ایسا مذاری چلے گی کتنے دن کھلے بازار میں دھڑکیا ہے؟ مال کو بازار نہیں ملتا، بازار کو گاہک نہیں ملتے۔ جب مال کو ٹھوں میں پٹا سٹرا ہے تو مزدور کو کوئی مزدوری کہاں سے دے۔ نیتا کہتے ہیں مال کی پیداوار بڑھاؤ، سو بڑھ گئی۔ اب نیتا یہ نہیں بتاتے کہ گاہکوں کی پیداوار کیسے بڑھائیں؟ کاش خوراک اگاؤ کا خرہ مارنے کے بجائے خریدار اگاؤ کی اسکیم چلا سکتے۔ مگر حزیار کا بیج سوائے امریکہ کے کہیں نہیں پیدا ہوتا۔ امریکہ نے تو کیا مزے سے سارے ملکوں میں ڈالر بوکر حزیاروں کے کھلیان قائم کر دیے ہیں۔

پران سب باتوں کی ذمہ دار آتما کی گندگی ہی تو ہے۔ چرخہ ہی تو بھارت کا ایٹم بم ہے۔ سوت کات کات کر انگریزوں کا اٹو کر دیا تو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کیا حقیقت ہے۔ جب آتما شدھ ہو جائے گی پھر ہی سوت کا جال سمندر سے مچھلیوں کی طرح ان گنت گاہک پکڑ لائے گا۔ یہی کچھ دہانگے اس دیو کا بھی بند بند جاکڑ لیں گے جو کر دٹ لے کر چونک رہا ہے۔ سب دکھ دور ہو جائیں گے۔

زنان خانہ میں مہمانی بھی بیٹھی تنگی کو مستح کر اپنے جیون کا امرت پخوڑنے پر جیٹی ہوئی ہیں۔ باوجود کوششوں کے وہ کھڈر نہ پن سکیں۔ ان کا اطلال اور کجواب

کی آغوش میں پلنے والا جسم کھدر کے گھسے نہ سہا سکا اور ہمیشہ پھندا اٹھتا۔ گرمی دینے پھنسیاں اور پھر بھورٹے بن جاتے۔ یہ رانی کے پہاڑ ویش سیوکا کو مرہم کا چچپاتا ہوا پھایا بنا دیتے۔ کچھ دن تک تو ماموں جان نے ان کے جسم کے زمینداری ٹھوس کو نہ گردانا، مگر جب ڈاکٹروں نے مریضہ کو سولے باریک ملل کے دوا میں ڈوبے ہوئے پھاپوں کے جلمہ ستر پوشی ہی سے منع کر دیا تو وہ مجبوراً اس شدھی سے باز آگئے ویسے بھی ٹنکچر اور آئڈو فارم کے جلمے پھیلنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد وہ انھیں تیسرے درجے کا نیشنلسٹ سمجھتے ہیں اور ایسے حقارت سے دیکھتے تھے جیسے ایک پہنچا ہوا پیر مرشد کسی مبتدی کو دیکھتا ہے۔

ممانی بھی ٹکلی گھار ہی ہیں مگر ان کی انگلیاں لرز رہی ہیں۔ ان نازک تاروں میں ان کے جذبات کی ہلچل کو سہارنے کی سکت نہیں۔ کیونکہ مس راج کی انگلیاں بھی تو قابو میں نہیں۔ ماموں جان کے گھر کے سارے ساز و سامان کی طرح آج ان کی پرائیوٹ سکریٹری بھی شدہ ہونے کا پختہ ارادہ کر کے ماموں جان سے نکلی چلا نا سیکھ رہی ہے۔

مس راج کی عمر کا ابتدائی حصہ یتیم خانہ میں گزرا جہاں وہ یسوع مسیح کے محبت کے سامنے خدا کی برگات کی حمد گاتی رہی۔ کھردرے، بد رنگ کپڑے پہنکر اور ناقص کھانے کھا کر اس نے خدا کی عنایات کی داد دی۔ یتیم خانے سے نکل کر وہ سیدھی فوج کے دفتر پہنچ گئی۔ جنگ کے یہ چند پر بہار سال اس کی زندگی میں روشن ستاروں کی طرح ہمیشہ درخشاں رہیں گے۔ وہ سیر سپاٹے وہ نقص و سرور کے جگھٹے سفید چمڑی والے عاشقوں کے نرغے۔ جو ان لڑکیوں کی کمی جس نے

کواریوں کو بھی پا پڑ بنا دیا تھا۔ اور وہ ایک خستہ پا پڑ کی طرح ایک جہڑے سے دوسرے جہڑے میں منتقل ہوتی گئی۔ انگریز سارجنٹ کے ہاتھ سے جب زیادہ الاؤنس پانے والے امریکن سارجنٹ نے اسے جیت لیا تو وہ گھنٹوں آٹے میں اپنی جوڑی ناک میں حسن تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

پھر ایک دم جیسے اُسے کسی نے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ جنگ ختم ہو گئی۔ گو اسے سو بھرا ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے اور وہ ایک لٹو کی طرح ان کے گردہ میں بھنٹے سے ایک سے دوسری ہاتھ میں منتقل ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کے بازو خالی فضا میں پھڑپھڑاتے رہ گئے۔ اس کے ساتھ والیوں نے جنگ کے زمانہ میں کتنا کچھ جمع کر لیا۔ یہ سفید سپاہی بڑے دل پھینک اور ساتھ ساتھ دولت پھینک بھی جاتے ہیں۔ جاتے وقت وہ اپنی محبوباؤں کو کیا کچھ نہ دے گئے جس میں سے کچھ کبار خاؤں کی نظر ہوا کچھ ہسپتالوں اور یتیم خانوں میں پہنچ گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو مس راج اور اس کے گروپ والی لڑکیوں کی جنگ شروع ہوئی اور انھیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ کتنی بد صورت اور بے مصرف ہیں۔ دوران جنگ میں انھوں نے جو کچھ ”تہنر“ سیکھے وہ امن کے زمانے میں کام نہیں دے سکتے۔

زندگی کے اس ادھا دھند چکر نے آج اسے نکلی پکڑا دی ہے ماموں جان ایک عبا، ماہر نفسیات ہیں پھر بھی کسی بار جھنجلا کر مس راج کی تحلیل نفسی کر چکے ہیں۔ وہ مختلف مغربی ماہرین نفسیات کے اقوال ذریعہ کے ذریعے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ مس راج کے تحت الشعور میں کوئی چٹھن ہے جو تار کو بار بار شنگی لگا دیتی ہے۔

ممانی بھی خوب جانتی ہیں کہ یہ تخت الشعور کی چھین کیا بلا ہے۔ مگر ان
 کی تحلیل نفسی نہایت پھوڑپنے کی بد نظمی ہے۔ جس کا اظہار کرنے کی طاقت وہ
 عرصہ ہوا کھو چکی ہیں۔ اگلے وقتوں کے لوگ کھلے بندوں زبڈی کے کوٹھے پر
 چڑھتے تھے، آج ان کے سپوت شعور اور لاشعور کی حلین ڈال کر وہی کچھ کر
 لیتے ہیں۔ مگر وہ اتنا جانتی ہیں کہ مس راج بھی ان سے کم مجبور نہیں۔ جینے کا
 خیال چھوڑ کر ساری عمر مس راج اسی طرح ادھیڑ عمر کے ماہرین نفسیات کی ذہنی
 ٹھوکروں میں رلتی رہے گی۔ ان کے لاشعور ہاتھوں کا کھلونا بنی رہے گی۔ ہر
 لمحے پر تار ٹوٹتا ہے تو جھلا کر چونک پڑتی ہیں۔ ان کا افغانی نسل خون کھول
 اٹھتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے نکلی بھینچنے لگتی ہیں۔ جیسے کسی کا گلا گھونٹ رہی
 ہیں، مگر دوسرے لمحے اہنسا کے سایے میں پٹی ہوئی شیرنی دبا کر سوت جوڑ
 لیتی ہے اور ایک موہوم سہارے پر آگے چل پڑتی ہے۔ وہ اپنی ساری نفسی
 کو اولاد نہ ہونے پر محمول کرتی ہیں۔ اگر آج ان کی گود میں ان چھڑ لڑکیوں کے
 بجائے ایک گھئی کا لدو ہوتا تو میاں کی مجال نہ ہتی کہ ان کے سینے پر یوں
 دماغی سوتیں چڑھاتے۔ مگر لڑکے کا زیج سدا بیکار گیا۔ خواہ ایک ماہ کا بھی ہوتا
 وہ اسے بیٹوں ہی کی صف میں کھڑا کر کے ماتم کرتیں۔ وہ ایک مرد کے ہاتھ
 کے میل پر پٹی بٹھیں۔ اب بھی ایک شریف مرد ہی ان کا کفیل ہے۔ پھر جب
 یہ مرد مردانہ دیتا ہے تو انھیں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے
 اگر وہ خود ایک سہارا بن سکتیں تو پھر بڑھاپا تیر ہو جاتا مگر ماموں جان کہتے
 ہیں یہ بھی ان کا خاندانی قصور ہے۔ عموماً نوابوں جاگیرداروں کے یہاں

اولاد نہ مینہ ناپید ہوتی ہے اور اس کا بھگتان وہ بھی بھگت لے رہے ہیں، ورنہ
خود ان کے جسم میں تو نہ بنانے کا کافی مادہ ہے۔

کون جانے جس تکلی نے سوراج دیا کیا وہ انھیں ایک بیٹا نہیں دے
سکتی۔ ایک دم ان کے چہرے کے کھنڈر جاگ اٹھتے ہیں۔ ڈراونی مسکراہٹ
ایک نئی کروٹ بدل کر انگریزی لیتی ہے۔ تکلی ناچ رہی ہے اور وہ مسکرا رہی ہیں
اس کچے دھاکے کو وہ اکلوتے بیٹے کی طرح پروان چڑھتے دیکھ رہی ہیں۔

ایک سوت پھر دوسرا تیسرا اور چوتھا۔ سارے مل کر
ایک مضبوط رسی بن جائے گی۔ مس راج کے گلے کو گھونٹتی چلی جائے گی۔ جس نے
ان کا جیون امرت چرا لیا ہے۔

یوں آج باپ کی جینیتی کے روز آتما میں شدھ ہو رہی ہیں۔ گندی
اور گھناؤنی آتما میں۔

مگر لال باغ اور پرپل کے علاقوں میں ایک بھی تکلی ناچتی نظر نہیں
آتی۔ کسی کو آتما کو پاک کرنے کی فکر نہیں۔ اس چھین بھپٹ اس منافع خوری اور
اشتہار بازی کے چوراہے پر دور کا مگار میدان میں ممبئی کے محنت کش امن
کانفرنس کے پہلے اجلاس کے موقع پر زندگی کے نئے پر وگرام بنا رہے ہیں۔
یہاں باشعور محنت کش طبقہ کی رہنمائی میں پھٹنی کی دھار سے زخمی مزدور، فیسوں
کے بار سے کھلے ہوئے طالب علم اور کم تنخواہ اور مہنگائی کے مارے کلرک اور معلم
تیسری جنگ کے خلاف امن کا غزم لے کر جمع ہوئے ہیں۔ پچیس ہزار جانیں ایک

قالب ہو کر اُمید بھری نظروں سے آزاد ملکوں کے رہنماؤں کی تصویروں کو تاک رہی ہیں۔ اپنے دلوں کی آواز اپنے ساتھیوں کے منہ سے سُن رہی ہیں۔
 "میسری جنگ نہ ہوگی..... انسان انسان سے نہیں، اس بار حیوان سے لڑے گا۔..... کالے بازار سے جنگ کرے گا۔ دُالر کے غلاموں کا مقابلہ کرے گا۔"

کون کتنا ہے یہ نہتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے خوفناک مہتیار ہیں جن کے تھیل ہی سے سلطنتیں لرز رہی ہیں۔ ایمم بجم کانپ رہے ہیں اور دُالر کے پل ٹوٹ رہے ہیں۔ یہ نظر نہ آنے والے پچیس ہزار فولادی تاروں کی ایسی سی بٹ رہے ہیں جو ساری فاشست قوتوں کا گلا گھونٹ ڈالے گی۔

جی بھی تو کامگار میدان کے چاروں طرف پولیس کا مسلح پہرہ ہے۔ سی آئی۔ ڈی کا چکر ہے۔ مزدور بد ڈنڈے منڈلا رہے ہیں.....

نا جاننا شراب پر پہرہ نہیں..... کالے بازار پر پہرہ نہیں..... چور اُچکوں پر پہرہ نہیں..... رشوت ستانی اور عصمت فروشی پر پہرہ نہیں..... دنیا بھر کی غلامیتیں پھل پھول رہی ہیں..... مگر امن چاہنے والوں پر پہرہ ہے..... موت بے لگام طرارے بھر رہی ہے اور زندگی کے لبوں پر تال ہے۔ سڑتے ہوئے گناہ کے سر پر قانون کی چھپاؤں ہے۔ شاداب انسانیت کے سر پر شیطانی آگ.....

آج میں اس مجمع کے درمیان میں کہاں کھو گئی ہوں۔ پچیس ہزار

دلوں کی دھڑکن میرے دل کی دھڑکن کچھ اس طرح اہم آہنگ ہو چکی ہے کہ
 دھونڈے سے نہیں ملتی۔ پچاس ہزار آنکھوں میں میری آنکھیں کون سی ہیں؟
 میری انفرادیت کہاں ہے؟ میرا شعور لا شعور، میری جبلت، میری اُجھٹنیں
 پریشانیوں اور میرے ذاتی دکھ درد کہاں ہیں؟

مگر اپنی وسعت پر خود حیران ہوں۔ ڈھونڈھنے کی کیا ضرورت ہے؟
 میری انفرادیت کا نگار میدان میں کھینچا کھینچا بھری ہے۔ یہ پچیس ہزار دل اور
 پچاس ہزار آنکھیں میری ہی ہیں۔ ذرا اور اوپر آنکھ اٹھاؤں تو پچیس لاکھ پچیس
 کروڑ..... نہیں مجھے گنتی معلوم کرنے کی ضرورت نہیں..... اس طوفان میں
 میں بھی ایک قطرہ ہوں..... اور ہر قطرہ طوفان ہے۔

یہ بچے

ایک زمانہ تھا جب میرا خیال تھا کہ دنیا میں بچے کے سب سے بڑے دشمن اس کے ماں باپ اور بھائی بند ہوتے ہیں۔ وہ اس کے دل کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ سچا زبردستیوں سے اس کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کو کچل دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو بجائے مکمل انسان بننے کے چور، ڈاکو اور اچکے بن جاتے ہیں۔ جی تو ہمارا دیش ترقی نہیں کر پاتا۔

لیکن خود ماں بننے کے بعد میرے خیالات نے ایک دم سے پٹا کھایا اور یقین ہو گیا کہ آج کل کے بچے ہی کچھ ضرورت سے زیادہ سٹیلے، بے چین اور منہ زور پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کی تعمیر میں ہی کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے جو انہیں خشکی بنا دیتی ہے۔ اگر سلیقے سے بچے پیدا کئے سجا میں تو ہمارے دیش کے دلدر دور ہو جائیں گے۔

اسی سلسلے میں میں نے سائیکالوجی سے مدد لینی چاہی اور جی بھر کر تحلیل نفسی کر ڈالی مگر بچا کیونکہ مجھے ہلکا ہی معلوم ہو گیا کہ یہ جس پگڈنڈی پر ہیں بہک کر چلی آئی

ہوں۔ یہ کچھ بھی نہیں۔" کی دنیا کے بچوں بیچ ختم ہو جاتی ہے، میرے دونوں خیال غلط تھے، نہ ماؤں کا قصور ہے نہ بیچارے بچوں کا۔ قصور سارا ہے اس طریقہ زندگی کا جو ایک مخصوص نظام نے ہمارے جانوں پر لاگو کر رکھا ہے جس نے ماں اور بچے کا رشتہ بھی توڑ کر ایک کاروباری شے بنا دیا ہے۔ ادل تو بچے کے خیال ہی سے ایک ماں لرز اٹھتی ہے۔ جسمانی کوفت کے ڈر سے نہیں، اس ڈر سے کہ گھر میں ایک اور کھانے والا منہ بڑھا۔ ایک اور جسم دھلنے کی فکر بڑھی۔ پھر اگر لڑکے تو خیر خدانہ کرے لڑکی ہے تو ایک اور تادان بھگتنے کو تیار ہو جائیے۔ اس کی شادی بیاہ کی فکر۔

لوگ کہتے ہیں کہ ادیبوں کو ادب سے سروکار رکھنا چاہیے اور خواہ مخواہ سرکار سے نہ الجھنا چاہیے تو بھئی یہاں کسے سرکار سے دست دگرمیاں ہونے کا شوق ہے۔ اب اس میں ہمارا کیا قصور کہ زندگی کے ہر موڑ پر سرکار سے ٹھیکر ہو جاتی ہے۔ کتنا ہی دل کو سمجھائیں، اب یقین نہیں آتا کہ ہماری مصیبتوں کے بڑھانے میں دیوی دیوتا یا تقدیر کا ہاتھ ہے۔ ہم اب پہچان چکے ہیں کہ کس کا ہاتھ ہے جس نے اپنے بھیاناک شکنجہ میں ہماری زندگی کی ضروریات کو دیوچ رکھا ہے وہ منافع خوروں..... چور بازاریوں کا ہاتھ جو ہماری سرکار کی لگا میں مقام ہے اور جس کے اشاروں پر ہمارے اوپر نفل مست حملے کرتا ہے اور ہم یہ سب کچھ اس لئے سمجھ گئے ہیں کہ ہمارے سامنے روس کی شاندار مثال ہے۔ جہاں کا نظام مزدوروں اور کسانوں کا ہے جو انھوں نے برسوں کی محنتوں اور قربانیوں کے بعد خود اپنے لئے تعمیر کیا ہے۔ روس میں بچہ جنجال نہیں۔ ملک کا ایک طاقتور بازو ہے

ملک کی دولت ہے، جہاں پیدائش سے پہلے ہی ماں کی تخلیقی عظمتوں کو مرجھا کر
 آنے والے مہمان کی او بھگت شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے بار بار واری کے کام
 نہیں لئے جاتے بلکہ اس کی صحت کو اور بڑھانے کے لئے ہلکے ہلکے دلچسپ کام لئے
 جاتے ہیں۔ اس کے لئے باقاعدہ خاص خوراک کا راشن مقرر ہو جاتا ہے۔ جب
 زمانہ قریب ہو جاتا ہے تو اسے ایک لچھے زچہ خانے میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں
 وہ بڑے سکون اور آرام سے جنم دیتی ہے۔ غلام ملکوں میں زچائیں فوراً ہی محنت
 مزدوری پر مجبور ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے اپنی رہی سہی طاقت کھو بیٹھتی ہیں۔
 مگر روس میں جب تک زچہ کو ڈاکٹر اس قابل نہیں سمجھتے زنگ بوم میں
 ہی رہتی ہیں۔ جب مکمل طور پر چاق و چوبند ہو جاتی ہیں تب وہ کام پر لڑتی ہے
 یہاں وہ بچہ کو کمر پر لا کر نہیں لاتی جیسے ہماری محنت کش عورتوں کو کرنا پڑتا ہے
 کہ دودھ پیتے بچے کو سڑک کے کنارے ریت دھول میں ڈال کر خود کام
 پر جٹ جاتی ہیں۔ روس کے سنہرے دلش میں بچوں کے گھر ہیں جہاں محبت
 کر میوالی نرسیں اور مشاق ڈاکٹر ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ دن بھر بچے وہاں
 بڑے آرام سے رہتے ہیں، شام کو مائیں انھیں اپنے گھر لے آتی ہیں۔ ہمارے یہاں
 دوسرے سے تیسرے بچے کے آنے کی خبر سے ہی ماں باپ کے ہوش اڑ جاتے ہیں
 پہلے تو محلہ لڑے ہی کی فن کار روائیاں اس کو الٹی میٹم دینے کی کوشش کرتی ہیں
 جس کی وجہ سے ملک میں ہزاروں عورتیں موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں، یا سدا کی
 روگی بن جاتی ہیں۔ مگر روس میں زرخیز ہونے کو جرم یا گناہ نہیں سمجھا جاتا، بلکہ
 جیسے اچھے پھل پھول پیدا کرنے پر کاشتکار کی شہرت ہوتی ہے۔ اسی طرح زیادہ بچوں

والی ماں کو تمنہ یا افعام ملتے ہیں۔ وہاں یہ سارے بچے ماں کی چھاتی پر مونگ
دلنے کو پلے نہیں رہتے نہ محلے بٹلے کا ناطقہ بند کرنے کو اچکوتوں کے گردہ مضبوط کرتے
ہیں بلکہ ان کے لئے بھی گھر ہوتے ہیں۔ جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا پورا خیال رکھا
جاتا ہے۔ یوں تو امریکہ اور انگلستان میں بھی ایسے بورڈنگ موجود ہیں جہاں بچوں
کو رکھا جاتا ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان ملکوں کے بچے چھوٹی عمر میں ہی نہایت
گندی عاداتوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ امریکہ کے مفکر بڑی فکر میں ہیں کہ یہ بچے
اتنے گمراہ کیوں پیدا ہو رہے ہیں اور وہ بیٹھ بیٹھ کر نفسیاتی توجہیں دھونڈ رہے
ہیں حالانکہ بات سیدھی سادی ہے۔ امریکہ کے بچے وہاں کے سامراجی نظام کی
پیداوار ہیں۔ جو والدین تجارتی منڈیوں اور سیاسی اسٹیج پر کر رہے ہیں، بچے دی
ہسکولوں اور کالجوں میں کر رہے ہیں، وہی لوٹ مار، وہی متہ زوری اور غنڈہ گردی
— آج وہ غنڈوں کے سردار ہیں۔ کل انھیں فرموں اور ملوں کا مالک بن کر اسی
کھیل کو حقیقت بنانا ہے، وہی رنگ و نسل کی تفریق، ایٹم بم کی دھمکیاں ان
کھیلوں میں رچی نظر آتی ہیں۔ ان ملکوں کو تو فخر کرنا چاہیے کہ ان کی آئندہ نسلیں اتنی
اتنی ہونہار پیدا ہو رہی ہیں تو پھر یہ حیرت اور تاسف کیسا؟ اس فضا میں پلنے والے
بچوں پر کوئی تعلیم کوئی تربیت اثر نہ ڈال سکے گی۔ سب سے بڑی تربیت عمل ہے
اور روس کی گورنمنٹ کا عمل وہاں کے عوام میں جھلکتا ہے۔ ہر روسی بچہ اس عمل کا
عکس لے کر زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ اسکے علاوہ بچوں کے لئے وہاں علیحدہ سینما گھر
تھیٹر اور لائبریریاں ہیں۔ جہاں انھیں کھیل ہی کھیل میں محنت کش اور مفید انسان
بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ طبیعت کے رجحان کو دیکھ کر اسکا آئندہ فرض زندگی مقرر کیا

جاتا ہے۔ وہاں انھیں بتایا جاتا ہے کہ ایک محنت کش ایک فنکار وہ خواہ کسی ملک اور کسی رنگ اور نسل کا ہو ساری دنیا کی دولت ہے۔ اور اس کی اپنی دولت ہے اور اپنے ملک کے لئے دولت خرید کر نہیں خود اپنے قوت و بازو سے پیدا کی جاتی ہے۔ بچوں کو ملوں میں بھاری کام نہیں دیے جاتے تاکہ ان کی بڑھواری نہ ماری جائے۔

وہ مائیں جن کے بچے دن رات ان گھروں میں رہتے ہیں، اپنے کام سے لوٹ کر وہاں جاتی ہیں اور وہاں اپنے ہی نہیں ہزاروں اور بچوں کو کیلجے سے لگا کر امتحان دے کر سکتی ہیں۔ روس کے دشمن کہتے ہیں کہ اجتماعی زندگی نے گھریلو زندگی کو فنا کر دیا ہے۔ ان حقوق کو کون سمجھائے کہ روس میں ایک باغیچہ کو بھی بچے کو دینے کی ضرورت نہیں، ملک کے سارے بچے ہی اس کے بچے ہیں، سارا ملک ہی ایک خاندان ہے جہاں نہ بچوں کی کمی ہو سکتی ہے نہ ماں باپ کی۔

مگر ہمارے ملک میں ہماری سرکار کی رائے ہے کہ شکر کے دانے گن گن کر مائیں بچوں کو جنم دیں، نہ ضرورت سے زیادہ بچے پیدا ہونگے نہ شکر کی کمی پڑے گی۔ کیونکہ اب یہ دڑ ہو گیا ہے کہ کمیونسٹ ماں کے پیٹ ہی میں بچے کے کان میں سرکار کے خلاف بھڑکانے والی باتیں پھونک دیتے ہیں۔ جی تو آج کل کے بچے جنم سے شکر و دودھ کے لئے منہ پھاڑے پیدا ہوتے ہیں۔

اسی لئے ہماری مہربان سرکار نے "اناج اگاؤ" کی اسکیم سے زیادہ رزورٹورسے بچے نہ اگاؤ" کی اسکیم چالو کرنے کی ٹھان لی ہے۔ ایسے ملک میں اگر کوئی دھیسٹ بچہ ان ہی ٹپکتا ہے تو وہ ایک مصیبت سمجھا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں

بچے آنکھ کا نور دل کا سرور ہوتے ہیں۔ ہوتے ہوئے، مگر ہماری آنکھیں تو آنکھوں کے اس نور کو ناکافی اور غلط خوراک کی وجہ سے بجھتے دیے کی طرح کا پتلا دیکھتی ہیں جس بچے کو دیکھتے دنیا بھر کے روگ جان کو چمٹے نظر آتے ہیں۔ خون کی کمی کی شکایت تو عام ہوتی ہے جسکی وجہ سے آئے دن بیماریوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اسپتالوں میں ننھے ننھے مر جانے ہوئے بھول ہزاروں کی تعداد میں کیوں کھڑے رہتے ہیں؟ سڑکوں پر لاکھوں معصوم ہاتھ ہماری طرف بھیاکے لئے پھیلے نظر آتے ہیں، اور ہمارا ضمیر اس طمانچہ سے تملاکمرا رہ جاتا ہے جس عمر میں روس کے بچے کھیل کود کر صحت بناتے ہیں۔ ہمارے بچے روزی کی فکر میں پریشان فٹ پاٹھ پر پاٹھ لیے بیٹھنے میں گزار دیتے ہیں، روس میں چودہ پندرہ برس کی لڑکیاں یونیورسٹی کی ڈگری کی تیاری کرتی ہیں۔ ہمارے ملک کی اس عمر کی زیادہ تر لڑکیاں فلمی گیت گنگنا کر ساجن کو پکارنے میں گزار دیتی ہیں۔

روس میں ہر بچے کو مفت تعلیم دی جاتی ہے بلکہ جبر یہ تعلیم دی جاتی ہے اور ہمارے ملک کے طالب علم انٹی جبر یہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان پر لاٹھی چارج ہوتے ہیں، گولیاں چلتی ہیں اور انھیں سزائیں دی جاتی ہیں اسکول میں داخل ہی نہیں کیا جاتا۔ اب تو نام ہذا تعلیم کے دروازے بھی بند ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری گورنمنٹ علم کو حماقت سمجھ کر فیس بڑھاتی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے جہاں پیٹ کی آگ بجھانے ہی سے فرصت نہیں ملتی وہاں تعلیم کے لئے خرچہ کہاں سے آئے؟ دوسرے ہمارے نیاؤں کا خیال ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوگ محنت سے جی چرانے لگتے ہیں مگر ہم جانتے ہیں کہ ہمارے نیا تعلیم سے کیوں ڈرتے ہیں کیونکہ

وہ جانتے ہیں کہ باشندہ انسان کا خون آسانی سے نہیں چوسا جاسکتا۔ بڑھ لکھ کر وہ اگر امر کی ہلاک کی تعلیم کے دائرے تک محدود رہے تب تو حیرت ہے مگر شکل یہ ہے کہ وہ روس کی تعلیم پر بھی نظر ڈالنے لگتے ہیں جو اسے مشین میں پسینے، ہلوں میں جوئے جانے اور کارخانوں میں ناکافی معاوضے پر جُٹے رہنے کے خلاف بغاوت پر ابھارتی ہے۔ ہندوستان کی مائیں جب روسی بچوں کی طرف دیکھتی ہیں تو وہ اپنے لعلوں کے لئے بھی دہی سہولتیں مانگنے لگتی ہیں جو انھیں میسر نہیں۔

جی بھی تو حکومت کے دشمنوں کے کیمپ میں جا شامل ہوتی ہیں۔ مگر ہماری مائیں محدود نہیں۔ ہمیں روس کے بچوں سے پیار ہے، دلوں کی خوش نصیب ماؤں سے پیار ہے، وہ خواہ کسی ملک رنگ اور نسل کے بچے ہوں۔ دنیا کے بچے دنیا کی ماؤں کے بچے ہیں۔ وہ ہمارے بچے ہیں۔ ان پر یہ منڈلاتے ہوئے گدھ چھاپہ نہ مار پائیں گے۔ ہم دنیا کے بچوں کے لئے، انسانیت کے مستقبل کے لئے ہر کردہ قہقت سے مقابلہ کریں گے۔ ہم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کھویا اپنے بچوں کی زندگی میں پانے کی کوشش کریں گے۔ ہم ان کے لئے ان کا مستقبل پر امن اور روشن بنانے کیلئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دیں گے۔

مبارک ہے وہ ملک جہاں بچے سچے معنوں میں آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے۔ مبارک ہے وہ ملک جو انسانیت کا محافظ ہے۔ جہاں عورت، ماں بن کر پھٹاتی نہیں بلکہ سوانیت کو چار چاند لگاتی ہے اور خیر کے ساتھ اپنی کوکھ کی دولت کو پھلتا پھولتا دیکھتی ہے۔

آج روس کی بیٹیوں ساگرہ کے موقع پر ہم عہد کرتے ہیں کہ روس کے
 غرام کو مشعل راہ بنا کر ہم اپنے بچوں کا مستقبل بھی اتنا ہی روشن اتنا ہی شاندار
 بنائیں گے جیسا روسی بچوں کا ہے۔ ہماری یہ جنگ ہمارے بچوں کی خاطر ہے
 ان کی حفاظت کے لئے ہم تمام فائزیت طاقتوں سے لڑیں گے۔

لال چوہنے

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اور اب بھی جب خزاں کے اختتام پر بورجھڑ کر پڑوں پر سبز مٹنے
ٹمٹمانے لگتے ہیں، دوپہر میں سنان اور اونگھتی ہوئی ہو جاتی ہیں اور
وقت کاٹے نہیں کٹتا تو پھر سے وہ بھولی بسری یادیں تازہ ہو کر دماغ
میں چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔

ایسی ہی ایک اجڑی ہوئی دوپہر کو جب لوہے کے جھکڑ آتشیں بھوتوں
کی طرح فضا میں ناچ رہے تھے اور سرکاریں بویہ کی ماہگ کی طرح اجڑی اور
خاک آلود ہو رہی تھیں۔ باسلیقہ انسان جس کی ٹیپوں کی آڑ میں دیکے
بیٹھے تھے۔ میں پھل پائی بنی آم کے درختوں کے نیچے سر اٹھائے اس تاک
میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادا درخت ہاتھ پڑ جائے تو یہ دوپہر اتنی
غملین اور دکھائی نہ رہے۔ میری باویہ پیمانی بے کار نہ لگی اور آن کی آن

میں دوپٹہ اتار، میں جھاڑ جھنکار ٹہنیوں میں ہرے ہرے متقے تلاش کرنے لگی۔ جھولی بھرنے سے پہلے ہی جی بھر آیا اور میں نے ایک پیاری سی کیری کو.....

اس سے قبل کہ میرے بھوکے دانت سبز چادر کو چاک کر کے مدہوش کن سفیدی تک پہنچتے ایسا معلوم ہوا کہ سارے جسم پر بجلی کے ننگے تار لپٹ گئے۔ میں مفلوج سی ہو کر نیچے پھسلی اور دوسرے لمحے گھر والوں نے مجھے مرغ نسل کی طرح زمین پر ترپتے ہوئے پایا۔

لال چوینٹے !

جب ذرا بدحواسی کم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ جسم پر لال لال چٹے پڑ گئے تھے۔ ہر چٹے کے بیچوں بیچ ایک بھیاناک چوینٹے کا لال لال سر یا قوت کی بوند کی طرح سفیدی پن سے ٹکا ہوا تھا۔ اس ہلے تو بہ میں دھڑ تو جھڑ گئے مگر تو بھیجے کھو پڑیاں اسی ڈھٹائی سے دانت گاڑے ہوئے تھیں۔ معلوم ہوتا تھا چنگاریوں کی چادر جسم پر چپک گئی ہے۔

یہ بتانا بے کار ہے کہ اس کے بعد کتنے دن مرہم سٹی، پیپ خون چسپا تے ہوئے مرہموں سے دست دگر میاں رہنا پڑا۔ پکے آموں سے الگ لٹکھ دھونا پڑا۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی جبکہ بڑے بڑے معرکے سر کر ڈالے ہیں، زندگی کے انجن نے جی بھر کر بھرتا بنا دیا ہے وہ دہکتی ہوئی دوپہر دل و دماغ پر اپنی مکمل عفریتیت کے ساتھ کھدی ہوئی ہے۔ اور اسی یاد کا واسطہ دیکر

ناظرین سے التجا ہے کہ خواہ آپ کی دوپہریں کتنی بھی اداس اور سنان ہو جائیں لٹر بھول کر بھی ایسی جگہ قدم نہ رکھئے گا جہاں یہ خونِ درندے اپنا خیمہ گاڑ چکے ہوں..... اودہ! آپ بھی مسکرا رہے ہوں گے کہ میں کتنی احمق ہوں، ماشاء اللہ آپ بھی کوئی ننھے ہیں جو صلیبی دوپہروں میں آدموں کی تلاش میں لال چوینٹوں سے الجھنے جائیں گے۔ تو عرض ہے کہ یہ دنیا بالکل گول مول ہے۔ قدم بڑھاتے وقت بعض وقت داؤں پیچ میں اپنا ہی پیر کھل جاتا ہے۔ یہاں ہر قدم پھونک پھونک کر دھڑکا چاہیے کون جانے یہ لال چوینٹے آپ کی آستین ہی میں سانپ بنے بیٹھے ہوں اور کیا؟ کون جانے؟ کم از کم میں تو نہیں جانتی تھی مجھی تو ایک اداس دوپہر کو پھر سے مجھے تنہائی اور بے کاری نے اکسایا اور میں بیتے ہوئے واقعہ کی یاد بھول کر دوبارہ لال چوینٹوں سے ٹکرا گئی۔ بات یوں ہوئی کہ ایک ٹھکی ہوئی سی شام کو جب تمام باسلیقہ انسان۔ سی۔ سی۔ آئی اور ریس کورس میں تہذیب اور انسانیت کا بے نظیر وظیفہ دہرا رہے تھے۔ میں بھٹکی ہوئی پھل پانی کی طرح سر جھکائے اس تاک میں گھوم رہی تھی کہ کوئی سیدھا سادا مشغلہ ہاتھ آجائے تو یہ شام اتنی نیم مر وہ اور پریشان کن نہ رہے۔ ٹیکسی کا میٹر چڑھ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ میرے غصے کا پارہ بھی اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ ہر سینما ہال کے آگے ڈراؤ نے اشتہار دیکھ کر اور بھی جی بھن گیا۔ وہ اشوک کمار کی چٹخنی جیسی ٹھوڑی، مہتاب کے ابلتے ہوئے ہونٹ، سورن تاکا دق زوہ ڈھانچہ۔ دنیا کا پہلوانی بازو۔ توبہ۔ میری ایسی کون خطا ہو گئی جس کے

جرم میں یوں عذابِ دوزخ سے ڈرایا جا رہا ہے۔

ٹیکسی مورڈ " میں نے جھٹاکر ڈرامور کو ڈانٹا۔ کو نے پرموٹر لوٹے
بچ کو رک گئی۔ سامنے ایک عجیب اخلاقت اشتہار لگا تھا۔

" امر ہندستان اکسپریس عوامی تھیٹر "

ان تین چیزوں نے بوکھلا کر رکھ دیا۔ یہ بھلا امر ہندستان کون شے ہے ؟
ضرور کوئی بھوتوں کا قصہ ہوگا۔ جی مجھے بھوتوں کے قصے بہت پسند ہیں
پتہ نہیں کیوں ! ضرور کسی محی کے افسانہ عشق کا جھگڑا ہوگا ورنہ حضرت
ہندستان کو تو رحلت فرمائے کافی عرصہ ہو گیا اور اب تو سڑگل کر دوسرے
ملکوں میں بطور کھاد کے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ہندستان تو بیشک
بنجر ملک ہے مگر اس کی کھاد بڑی زرخیز ثابت ہو رہی ہے۔ میں زیادہ
حیل و حجت کی قائل نہیں۔ حکمائے اعظم کے اس بیان پر کہ ہندوستان مرچکا
میں نے کبھی کا فاسدہ پڑھ ڈالا ہے۔ جب مر رہی گیا تو پھر اوپلا سے کیا
فائدہ۔ لاش پیٹنے سے کیا حاصل۔ مرحوم کی روح کو اور عذاب ہوگا۔ بہتر
تو یہی ہے کہ اس سڑاندی لاش کو چٹ پٹ دفن کر کے دھوم دھام کا
یتیجہ کیا جائے اور دوسرے زندہ ملکوں کی طرف منہ اٹھا کر دل کو ڈھارس
دے لی جائے۔ بھئی ہم نے تو اپنی سی سب کر دیکھی۔ دیکھیے نا۔ کمبخت ملک
کی خاطر کیا کیا دکھ نہیں سہے۔ گود بیسے خود میں نے تو نہیں مگر ہاں میرے
پیارے ملک کے احمق جاں نثاروں نے کیا کچھ نہ بھگتا اور بھئی کیا میں بذات
خود بھگتتی تبھی کچھ ہوتا۔ ایسے کیا مجھ میں سرخاب کے پر لگے تھے کہ میری قربانی

سے پھٹاک سے ملک آزاد ہو جاتا۔ ارے بھئی اس ڈھیٹ ملک کو آزاد
 ہونا ہوتا تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا۔ اب کیا ضروری تھا کہ سب کے سب
 لپیٹ میں آجاتے اور کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بھئی کچھ اُمید ہو تو کوئی کچھ
 کرے بھئی۔ ہاں نہیں تو ویسے اوٹ پٹانگ کی قربانیاں کر بیٹھو۔ جیل سے
 بچے تو عمر جیل یعنی سرکاری نوکریاں ایک سرے سے نصیب سے غائب۔ بھئی
 نہ تو میں ایسی حماقتوں کی طرف دار اور نہ ہی قابل۔ اور کیا؟

ہاں تو میں نے کہا کیا ہرج ہے آج "امر مہرستان" کا ڈھکوسلہ ہی
 چلے۔ ارے ایسا بھی کیا ڈرنا۔ کوئی بھوت تھوڑا ہی لپٹ جائے گا۔ دوسرے
 اکسیرس! یعنی ویسی ٹھرا اور ایک دم تاج میں! کیا کچھ نہ معجون مرکب ہوگی
 مگر لفظ "عوامی" سے ذرا جی کھٹکا۔ کیا کہے گا ٹیکسی والا کہ نیم صاحب دیکھنے
 میں تو خاصی ہیں پر ہیں ذرا نچلے طبقے کی۔ خیر جی کر اگر کہے ہی دیا۔

دردارنسے پر سے ہی جی بیٹھنے لگا۔ قدم رکھتے ہی سلنے دو چار۔
 نچے کھٹے گنجنے حلیے کے ہیولی منڈلاتے نظر آئے۔ دو تین بھپو ہڑ قسم کی
 لڑکیاں! پر دگرام بیچ رہی تھیں۔ و میننتی کو تو میں صاف پہچان گئی۔ پر لے
 ورجے کی پگلی۔ ماشا اللہ پوری آستین کا کرۂ گرمی کے زلمے میں دانتوں
 سے نوچ کر نیم آستین بنالیا جاتا ہے۔ کنا سے ترپنے کی تو فیتق نہیں اور چلی
 ہیں پر دگرام بیچنے۔ ارے ایسا ہی تھا تو پوٹ والا کی لڑکیوں کو بلالیا ہوتا۔
 خدا قسم ٹامیوں تک کا پٹاؤ کر ڈالیں! بارہ آنے کا پر دگرام پورے ایک
 روپے کیں لے کر میں تو جلدی سے آگے بڑھی۔ ٹپ دینے کی کمبخت ایسی

بڑی عادت ہو گئی ہے۔

ہال میں جا کر منہ اتر گیا۔ بس یہ سمجھے بنگال کے قحط کا سماں کھنچا ہوا تھا۔ پراگندہ اکاڈکافلک کی ستائی صورتوں کے دو چار بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اے ہے یہ میں نے کیا حماقت کی اس سے تو بھگت بوڈانا ہی دیکھ آتی۔ خیر کیا ہوا جی میں سوچا لوٹ چلوں کہ ایک دم سے میری نظریں لڑکھڑا کر رک گئیں۔ سامنے تیسری کرسی پر راج بیٹھا ہوا دھوئیں کے بادلوں میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تو میری باد یہ پیمانی بے کار نہ گئی۔ دوسرے لمحے راج میرے برابر والی کرسی پر تھا اور میں اس کے سگریٹ کے دھوئیں میں غلطاں اور پیچاں۔

لیجئے بسم اللہ ہی غلط۔ پر وہ اٹھا تو دو چار ملگے کپڑے پہنے اُجڑے حلیے کے لوگ نظر آئے۔ نہ پوڈر نہ دوڈر، نہ جھم جھماتے کپڑے بس مسلی ہوئی دھوتیاں اور ٹھیلے ڈھالے کرتے اور قومی ترانہ شروع ہوا۔

مجھے یاد ہے یہی ترانہ علی گڑھ کالج میں صبح گایا جاتا تھا کیا سہیلی اور میٹھی بیٹھی لے ہوتی تھی کہ گاتے ہی میں جمائیاں آنے لگتی تھیں اور روز یہی جی چاہتا تھا کہ بس آج تو بجائے پڑھانے کے سب لڑکیوں کو نرم نرم تکیے دے کر ہال ہی میں پڑ رہنے کی اجازت دے دی جائے تو مزہ آجائے۔ شروع میں تو خیر مگر جوں جوں فغمہ تیز ہوتا گیا دل کی حرکت بڑھتی گئی۔ آخر میں ایسا معلوم ہوا کہ دل دو مانع کی ساری کھڑکیاں کھولی ہی نہیں

گیں بلکہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر توڑ ڈالی گئیں۔ جانو جو تے مار مار کے منڈایا جا رہا ہے کہ "ہندستان ہمارا" گرج گرج کر چنگھاڑا جا رہا ہے کہ ایک دفعہ کو بہراکان بھی چنچ اُٹھے۔ بھلا ان اسد کے بندوں سے کس نے کہا ہو گا کہ اتنی گرمی کے زمانے میں ایسا بھڑکتا ہوا راگ رکھ دو کہ دماغ میں چر کے لگنے لگیں اور جی بے بات ہلکان ہو جائے۔ غریب راج ویسے ہی جذباتی ہے۔ اس کا سینہ اوپر نیچے ہونے لگا پروگرام کا ورق الٹا۔

اندھیری گھپ سیڑج پر لال لال بھوت اپنی پوری خباثت سے بھپٹا نقارے کی چنگھاڑ سن کر سارے ساز چونک اُٹھے، غراٹے لگے۔ نفیری چنچ اٹھی اور تار کتے تار بھٹانے لگے۔ سازوں کی فوج پکار پکار کر انسانوں کو پکارنے لگی دم بھر میں جی دار چاروں طرف سے ننگی تلواریں چمکاتے ٹوٹ پڑے۔ پرے کے پرے اُمنڈ کر دشمن پر الٹ پڑے نیپے ٹکے قدموں سے بڑھتے ہوئے تیکھی تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ سب کے سب نشانہ باز بھڑک کر میری آنکھوں میں گھسنے لگے، مگر مجھے آنکھ جھپکانے کی ہمت نہ ہوئی۔ خدا خدا کر کے پر وہ گرا اور میں نے جھنجھوڑ کر اپنے آپ کو جگایا۔ لاجول دلاؤ تین آدمی تو تھے ہی سیڑج پر اور وہ بھی ٹڈوں جیسے سوکھے مارے۔ یہ میرے واسطے نے انھیں تین ہزار بلکہ تین لاکھ کیوں بنالیا اور تین ہی تو عورتیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بچھو لے بچھو لے گالوں والی۔ مگر یہ ان کی آنکھوں میں کیا دھاک رہا تھا۔ جیسے دبے گھٹے آتش فشاں کا نیلا نیلا دھواں۔ !

جی جا ہا گھبرا کر بھاگوں ! مگر جیسے وہ مصنوعی تلواریں میرے جسم

کے دو ٹکڑے کر گئی تھی " بھاگ یہاں سے " پیر کہتے تھے ۔

" ذرا ٹھہر ! " دل نے پکارا ۔ ان اعضا کی تو تو میں میں سے ہلکا ہو کر میں اور بھی سہم گئی ۔ پسینہ پونچھ کر میں نے راج کی طرف دیکھا اور بالکل ہی لرز گئی ۔ پر وہ گر چکا تھا ، مگر معلوم ہوتا تھا اس کی آنکھوں پر سے جلدی جلدی سینکڑوں پت پر دوں سے اٹھتے چلے جا رہے تھے ، اس کی آنکھوں میں ایک زہر میں بھی ہوئی چمک تھی اور ہزاروں ننکی تلواریں ناچ رہی تھیں ۔ اس کا سینہ بوجھل بادلوں کی طرح اُبل اُبل کر دب رہا تھا ۔

" راج ! " میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا ۔ مگر جلد ہی اس بہو نچال سے سہم کر میں دور ہٹ گئی ۔ " راج ! " میں نے پھر پکارا " کیا طبیعت خراب ہے ؟ " " نہیں تو ۔ " اس نے اپنے آپ کو کسی دور دراز دنیا سے واپس کھینچ کر کہا " گھر چلو گے ؟ "

" نہیں ۔ " اس نے ڈانٹ بتائی ۔ تو بہ ہے ۔ لعنت ایسے تماشے پر کہ جی ہلکان ہو جائے ۔ " یہ اُلٹے ہاتھ پر شانتی تھا اور سامنے پریم ۔ ۔ ۔ ۔ میں ان سب کو جانتا ہوں " اس نے فخر یہ کہا گویا ان سب کو جاننا مقصدِ زندگی ہو ۔

" وہ سچن شکر تھا ، ادوے کا رشتہ کا بھائی ! "

" ارے وہ لمبو ترا سا ؟ "

" وہ لمبو ترا سا قطعی نہیں تھا ۔ " اے لو ۔ راج برا مان گیا ۔ " وہ بہت

خوبصورت ہے ۔ " " ضرور ہوگا " میں نے جل کر کہا " مگر ادوے شکر کا بھائی

خوب کما تا ہو گا۔ ” وہ کچھ بھی نہیں کمانا۔ ” گویا کچھ بھی نہ کمانا بڑے کمال کی بات ہے۔ ” چالیس روپے ملتے ہیں۔ ”

” روز ؟ ” ” تو اور کیا کسی کا سرے گا۔ ”

” جی۔ روز نہیں، مہینہ بھر میں۔ ”

” ارے۔ اور اس سے شکر اسے کچھ نہیں کہتا۔ ”

پروگرام کا دوسرا ورق الٹا۔ مگر میں ان احمق نوجوانوں کے متعلق ہی سوچتی رہی۔ آہ یہ ہونہاریوں مٹی میں عاقبت رُلا رہے ہیں۔ اس صاحب ہی تو دقت ہے کمانے کا۔ اور کچھ نہیں تو کسی فلم کمپنی ہی میں چلے جائیں۔ دیکھئے نا۔ کیا بھیانک ناچ فلموں میں ہوتا ہے اور لاکھوں مل جاتے ہیں۔ اس سے تو کچھ ہمارا ج ہی زیادہ عقلمند ہے۔ مزے سے ایک ناچ سیکھ لیا ہے بس اسی کے ذریعے ہزاروں کماتا رہا ہے۔

میں نے چونک کر راج کو دیکھا۔ وہ آتش نشانی کیفیت غائب کر کے مجسم شرابنا بیٹھا تھا۔ اسٹیج پر رنگ برنگی چڑیاں سرتال پر بھدک رہی تھیں معلوم ہوتا تھا وہ ساز پر نہیں ناچ رہی ہیں بلکہ یہ میٹھے میٹھے سران کی نازک نازک حرکتوں سے ٹپک رہے ہیں۔ ان کی ہر لرزش جھنکار بن کر فضا کو مرتعش کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہروں کی صورت میں دل پر چھلے جا رہی تھیں۔ نھنی نھنی ہزاروں گدگدیاں سی دماغ کی رگوں میں رینگتی احساس کو ڈبو کے دے رہی تھیں۔ اور آج — ؟

راج بے حس تھا مگر معلوم ہوتا تھا اس کا وجود ناچ رہا ہے۔ اس کی

آنکھیں خفک رہی ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے دڑ لگنے لگا کہ کہیں یہ عوامی
بھمیلہ مجھے پسند نہ آجائے۔

”کیا یہ بھی اسی کمپنی میں نوکر ہیں؟“ ختم ہونے پر میں نے پوچھا
”نوکر نہیں، یہی مالک ہیں۔“

”خیر ہوں گی“ میں نے جل کر کہا ”مگر چالیس روپے میں تو....
اور راج نے لمبا چوڑا لکچر دے ڈالا۔ نہ جانے کیا کیا میں سوچتی رہی
پاگل ہیں یہ لڑکیاں۔ ذرا دیکھئے نا فلم میں کیوں نہیں چلی جاتیں۔ کیا ایک
سے ایک ٹیڑھی تکیونی، بھینگا ہیر و من بھری پڑی ہے اور ایک سے ایک
زیادہ کمار رہی ہے۔

اور ان چھ لڑکیوں کی حماقت سے مجھے لاکھوں کا قومی نقصان ہوتا
نظر آیا۔ جی بھی تو ہندستان اتنا غریب ہے۔ جڈن بائی کو دیکھئے خدا کے فضل
سے آج اپنی ذاتی کمپنی کی مالک ہیں۔

اس کے بعد ”مقدس رقص“ شروع ہوا۔ اسے تو اچھا بھلا رقص کا
فن جانتے ہوئے یہ لوگ اتنے احمق کیوں ہیں؟ کم از کم یہ رقص تو کسی طرح بھی
معمولی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر کچھ ہتک سی محسوس ہوئی کہ اس عوامی تھیٹر میں اس قدر
شاندار فن کہیں سے اڑا لیا گیا ہے۔ کس قدر دسترس ہے اور وہ کمبخت طوطے
کی شکل والا تو کیا جسم کو مروڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مجھی کو اکٹھا اکٹھا کر پٹنیاں
دے رہا ہے اور اب جسم کے پُر زے پُر زے اڑے اور اب اڑے۔

میں تو سخت ارادہ کر کے آئی تھی کہ یہ سبت طبقے کا تماشا پسند کرنا ایک

سرے سے مجھے اس ہی نہیں۔ میں اسے سراسر تضحیح اوقات سمجھتی ہوں۔

”یہ کون ہے دھوبی کی شکل کا؟“

”ہنسنے یہ بنوئے ہے۔“ راج نے ایک لمبا سا لکچر بھر شروع کر دیا اور میں ہنسنے لگی۔ کتنی مضحکہ خیز شکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کلوا دھوبی نے گاڑھی جی کی آنکھیں چرا کر لگالی ہیں۔ جب گاتا ہے تو اور بھی غیر انسانی سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر نعمتہ کی باریک لڑیاں بکھر جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے گلے میں تو سازوں کا خلاصہ پھوڑ کر بھر رکھا ہے۔

”یہ کون ہے گول مٹول ریوڑی کسی؟“

”یہ پرستی سر کا ہے۔“ راج نے اس قدر میٹھی مسکراہٹ سے کہا کہ میرا جی کڑوا ہو گیا۔ میں سوچنے لگی۔ راج کو آج ہی وہ سونے کے بٹنوں کا بیٹ پر پرنٹ کرنا پڑے گا۔

”اور وہ کون ہے؟“ میں نے کیو پڑ جیسے گھنگھریالے سر اور مونا لرا جیسی آسمانی مسکراہٹ میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

”یہ روی وا ہے، اودے شکر کا چھوٹا بھائی؟“ اور میں سوچنے لگی کہ اودے شکر کا پورا خاندان کسی ہلکے مرض میں مبتلا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ ہر ساندے سے مذاق کر رہا ہے۔ ابھی قبلہ ہے تو ذرا سی دیر میں تار۔ دو گھڑی بعد جھانجن سے چھپر چھاڑا اور پھر بانسری سے چٹخارے آدمی ہے کہ سازوں کا جمہدار۔ تو یہ۔

ہاں تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ میں کیا کہہ رہی تھی جی کہ وہ لال

چوینے لگے۔ مجھے احمق نہ سمجھے، میں اوٹ پٹانگ کہنے کی عادی نہیں۔ پردگراں
 کا آخری حصہ شروع ہوا۔ اختتام پر وہی بھولی بھری دہکتی ہوئی سنان دوہر
 جب میں کچے آموں کے لالچ میں پڑ رہا تھا گئی تھی۔ اپنی پوری ہولناکی
 تباہیوں کے ساتھ دہرائی جانے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لال چوینٹوں کی فوج
 نے دل و دماغ پر حملہ بول دیا۔ بھیجے کی رگوں میں ڈنک سے چھٹے اور زہر
 پھیلتا چلا گیا۔ ہوا میں چاروں طرف سے غیر مرئی چانتے گھومنے لگے۔ احساس
 پٹاخوں کی طرح چٹخنے لگا۔ جوں ہی پردہ گرا میں نے اپنے آپ کو ٹیکسی میں ہانپتے
 کانپتے ڈرائیور کو جلدی چلنے کی التجا کرتے پایا۔ جیسے میرے پیچھے بھوتوں کے
 غول کے غول بھاگے چلے آ رہے ہوں۔

وہ دن اور آج کا دن خواہ کچھ بھی ہو۔ کتنی بھی اُداسی اور تنہائی
 چھائی ہوئی ہو۔ زندگی کتنی بھی سُستی سے گھسٹ رہی ہو میں اپنے پُر امن
 بل سے نہیں نکلتی۔

اور آج میں نے سوچا کہ میرا فرض ہے خلق خدا کے بھلے کے لئے آگاہ
 کر دوں۔ اور آپ کو خدا کی قسم یہ مضمون ضرور پڑھے گا۔ اس سے لاکھوں کا بھلا
 ہوگا۔ دیکھئے وہ جو میں نے زمانہ ماضی میں چند احمقانہ چیزیں لکھ دیں
 انہیں بھول جائیے۔ اب میری کاپیا پلٹ ہو گئی ہے اور لوگوں کی فلاح و
 بہبود ہی میرا دین و ایمان ہے لہذا جاگئے اور کانوں سے روئی کی گویا
 نکال پھینکیے۔ ہتھیار اٹھائیے اور جی توڑ کر دشمن کا مقابلہ کیجئے ورنہ وہی
 ہوگا جو روس میں ہوا اور جس کے خلاف تمام مہذب قومیں ہتھیار اٹھا چکی ہیں

اٹھارہی ہیں اور ابد تک اٹھائی رہیں گی۔ اٹھئے اور ان مہذب قوموں کا
 ساتھ دیجئے ورنہ یہ برسوں کی گھٹی گھٹائی تہذیب کا نظام ڈنگا جائے گا
 یہ صدیوں کے مقدس اصول بکھر جائیں گے۔ غرض تمدن کے کنکڑے اپنی
 جگہ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ علم و مہر کو عوام کے غلیظ پیروں تلے کچلنے کے لئے
 پھینکا جا رہا ہے۔ یہ لال چوینے والے پیر ہر جھکائے دھاری دار نیزوں جیسے
 ڈنک بڑھائے چپکے چپکے ہمارے نظام کی طرف رہنما رہے ہیں۔ آنکھ بھی تو
 یہ غلیظ سڑکوں کے کیرے جسم کو چاٹ کر کھوکھلا کر ڈالیں گے۔ یہی ناچ رنگ جو
 آج یہ لوگ تماشہ کہہ کر دکھا رہے ہیں، ایک دن تگنی کا ناچ نہ بچا دے تو میرا
 نام پٹ کر رکھ دیجئے گا۔ اس تماشے کے خاتمے پر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حقیقت کا
 لباس نہ پہن لے ورنہ یقین مانئے جا رہا ہے اور محفل خواب ہو جائیں گے اور
 شرفا بھی عوام کی طرح ننگے ہو جائیں گے۔ دیکھئے نا ہماری ملوں میں اتنا کڑا کہاں
 سے آیا کہ یہ اتنے ننگے جسم ڈھانک دیے جائیں اور اگر کو شمش بھی کی گئی تو یہی ہی
 شرافت بھی خاک میں مل جائے گی۔ یہ جو دو چار بچا رہے خوش پوش ملک اور
 قوم کی عزت بنائے بیٹھے ہیں، بھی نہ رہیں گے۔ وہی گارٹھا گزی باہر والے
 ہنسیں گے۔ دہانت آدے کا کیا ہوگا؟ رسیا مل اور بھگو مل کہاں جائیں گے؟
 اگر آپ یوں ہی سوتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب سب کچھ تباہ ہو جائے
 گا۔ دیکھئے یہ لال چوینے والے بھی ایک باریک سی قطار میں گزر رہے ہیں۔ ایسا نہ
 ہو کہ چپکے چپکے یہ قطار قطاروں میں تبدیل ہو جائے۔

گو یہ تو اطمینان ہے کہ ان کی پہنچ اسکو یوں میں نہیں اور ہمارے بچے

مرنے سے صحیح تاریخ رٹ رٹ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا
 اخبار نہ ہی دلچسپ اور نہ چٹ پٹا۔ خشاک کاغذی چتھڑا جس کی اشاعت مست
 قلندر سے دس گنی کم ہے۔ جو اتنا ردی پھیتا ہے کہ ردی کاغذ کی جگہ استعمال کرو
 تو کالک چھوٹنے لگتی ہے، مگر یہ نئی چال۔ مگر یہ نئی چال جو عوامی تھئیٹر کی آرٹیکر
 چل رہے ہیں کافی دیر سے زیادہ خطرناک ہے۔ ذرا چھپو راہنہ دیکھئے ان کا۔
 تماشہ کہہ کر ڈگڈگی بجا کر بلاتے ہیں۔ اور وہاں خود آپ کا بھیانک اور مضحکہ خیز
 میوے بنا کر سچلنے لگتے ہیں۔ ذرا سوچئے۔ رقص دیوتاؤں کی وہی ہے کیا
 یہ جائز ہے کہ اسے تاریخ کا کچھ مرنے کے لئے پست کیا جائے۔ امر ہندستان
 میں صاف ان لوگوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ انگریز بحیثیت
 سوداگر آئے تھے اور چٹکیوں میں ہندستان کا سودا کر بیٹھے۔ حالانکہ میں نے
 آٹھویں جماعت میں صاف صاف پڑھا تھا کہ بیچارے انگریزوں نے کافی سے
 زیادہ انکار کیا مگر مجبوراً قسمیں دے دے کہ ہندستان ان کے سر مرٹھ دیا گیا۔
 سو غریب اسے اب تک بھگت رہے ہیں حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ کتنی
 شریف اور راست باز قوم ہے۔ ہندستان کی خاطر یہ لوگ کیا کیا دکھ نہیں
 کھاتے۔ حضور گورنر جنرل اپنا اچھا خاصا ملک اجاڑ کر یہاں دوزخ جیسی
 گرمی برداشت کرنے تشریف لاتے ہیں۔ یہ کیا کچھ کم ہے اور پھر پارٹیاں کھانے
 اور گولے کے بار پہننے کے لئے کتنی کتنی دور جانا پڑتا ہے۔ بیچاری ملک وکٹوریہ
 تو خود دلی تک آگئیں۔ چیلوں کے بیٹھنے کے لئے اپنا مجسمہ تک لگوا دیا۔ اور اس
 سے زیادہ کوئی کہ بھی کیا سکتا ہے۔ خاص طور پر ایسے ہندی ملک کے لئے

جہاں لوگ زبردستی کال ڈالنے کے عادی ہوں۔ اب یہی دیکھئے نا بنگال میں لاکھوں مرگئے مگر کالوں سے اتنا نہ ہوسکا کہ کما کھاتے۔ اور تو اور سنا ہے ہوٹلوں کے باہر پڑے مرتے رہے اندر جانے کی تکلیف گوارا نہ کی۔ کیا کلکتے میں ہوٹلوں کی کمی ہے؟ کبھی یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو گے تو آپ کو بھوک لگے گی۔ کنواں پیاسے کے پاس جاتا ہے یا پیاسا کنوئیں کے پاس۔ اور وقت کی پابندی تو ہم ہندوستانیوں کو کبھی آئی اور نہ آئے گی۔ وقت پر نہ کھانے سے بھوک بھی مرجاتی ہے اور بھوک مرجانے سے آدمی آپ ہی مرے گا۔

اگر آپ نے اس زمانے میں ذرا سا بھی فائدہ کمایا ہے تو آپ قطعی یہ تماشہ نہ دیکھنے جائیے گا۔ خواہ مخواہ ان لوگوں کی بد مذاقی کی وجہ سے آپ کے دل کو ٹھٹھیں لگے گی۔ یہ حاسد کسی کا فائدہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ کسی نے محنت مزدوری سے چار پیسے کمائے اور ان کے کھجے میں آگ لگی اور یہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ زیادہ تر معصوم منافع خوروں ہی کو بدنام کرتی ہے۔ لوگ ان ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے نا اس ہزار کے نوٹوں والی بد مذاقی میں سوائے کنگال اور بھاک منگوں کے اور کون بھینسا ہوگا۔ بیچاروں کو ہزار ہزار کے نوٹ چار تین تین سو میں بیچنا پڑے۔ ذرا حساب لگائیے تو معلوم ہوگا کہ ایک کلکتے کو کم از کم لاکھوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اور پھر لوگ شور مچاتے ہیں کہ ہندستان میں گداگری کی لعنت ہے۔

یہ لوگ ہاتھ دھو کر کالے بازار کے پیچھے پڑے ہیں۔ بزنس کی ہو تو کلے گورے کا پتہ چلے۔ یہ بزنس مذاق نہیں کہ اُٹھے اور نا چنے لگے۔ اکنو کس

کے بارے میں الف کے نام لکھ نہیں آتا اور چلے ہیں تنقیدیں کرنے! یہ تو شاید بالکل ابتدائی جماعتوں میں سکھایا جاتا ہے کہ رسد کم — مانگ زیادہ مانگ کم — رسد کے پو بارے — ایک عقلمند انسان چاہے تو ایک من چاول سے اتنا کھا سکتا ہے کہ ایک احمق ایک من سونے سے بھی نہیں کھا سکتا۔ صاحب! یہ تو بزنس کے گڑ ہیں۔ اگر ہمارے قوم کے بیوپاری اس وقت رسد کنٹرول نہ کرتے تو آج اتنی اطمینان بخش مانگ ہرگز نہ ہوتی۔ اچی بھی چاول بھوسے کے بھاؤ پھسکتا۔

اگر آپ یونہی غافل رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہندستان میں بھی وہی ہوگا جو دوسرے ذلیل ملکوں میں ہو رہا ہے۔ خواہ آپ کو کتنی بھی سستی سار ہی ہو، کام ضرور کرنا پڑے گا۔ آپ کے پیارے بچے یتیم خانوں میں چلے جائیں گے۔ اور بیوی سرکاری طوائف بن جائے گی۔ جی ہاں یہی ہوگا۔ چاہے پوچھ لیجئے بڑے بڑے لیڈروں سے سب یہی کہتے ہیں۔ اور کیا! اور میں کہے دیتی ہوں کہ یہ لال چوینٹے تہذیب و تمدن ہی نہیں بلکہ موجودہ سرکار کے خلاف بھی لوگوں کو بھڑکاتے ہیں۔ یہ سب انگریزوں کے پھٹو ہیں۔ اُنھ پتہ نہیں بھئی یہی کہتے ہیں لوگ کہ سرکار برطانیہ نے بڑے غور و خوض کے بعد ان لوگوں کو اپنے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ کیا پتہ بھئی! لوگ ہی کہتے ہیں کچھ ہوگا۔ جی بھی تو دنیا کہتی ہے بڑے بڑے لیڈر کہتے ہیں تو کیا خدا خواستہ مذاق کرتے ہیں۔

یہ میل کے قائل ہیں۔ صاف بات اس گھمبیر کی گرمی میں تو میں کسی

سے لٹا حماقت سمجھتی ہوں۔ کہاں یہ کہتے ہیں ایک ہو جاؤ! ذرا سوچئے اگر ایک موٹے سے مٹیے میں ایک سوکھا مارا مسلمان گھول دیا جائے تو کتنا بڑا ڈھیر ہو جائے گا۔ ابل نہ پڑے گا مادہ؟ اس گرمی کے موسم میں چھپچھپاتے پسینے میں سرق۔۔۔ جی چاہتا ہے بس چلے تو اپنے ہی جسم کو چیر کر آدھا کر دے نہیں بھئی! میں گھنچ تچ سے بہت ڈرتی ہوں۔ دوسرے ہندو مسلمان کا جوڑی کیا۔ بھلا آگ اور پانی کا بھی میل ہو سکتا ہے۔ اگر مل بھی جائیں تو نتیجہ؟ بھاپ! اشر تو بہ۔ بھاپ کی سینہ زوری سے کون واقف نہیں! اس ٹھنڈے آنجن میں بس بھاپ کی کسر ہے۔ اگر غلطی سے پوری ہو گئی تو بس لوگ منہ پھاڑے دیکھتے رہ جائیں گے اور یہ ہیبت ناک آنجن اس جگمگاتی دنیا کو روندنا سر مست مہاشی کی طرح دذماتا اشر جانے کہاں جا کر دم لے گا۔

لہذا ابھی وقت ہے جاگئے اور اپنی پوری طاقت لگا کر اس خونی فرقے کا مقابلہ کر ڈالئے۔ ان کے بل معلوم کیجئے اور تیز سے تیز فلیٹ کا نسخہ ایجا کر کے استعمال کیجئے۔ یہ ویسے نہ ملیں گے۔ ان جراثیم کی تلاش میں آپ کو اچھے بھلے تندرست جسم چیرنا پڑیں گے۔ ہزاروں ناموں اور کاموں کی آرٹ میں چھپے یہ اپنا زہر پھیلا رہے ہیں۔ کہیں یہ اخباروں کے اوراق میں دبکے بیٹھے ہیں تو کہیں ادب کی ٹٹی کی آرٹ لے رکھی ہے، کہیں تھیٹروں کا ڈھونگ رچائے زت اور سنگیت کے ذریعے کانوں میں زہر گھول رہے ہیں تو کہیں پردہ سیسہ کے نیچے سماج کے حق میں دیک بن کر رہناگ رہے ہیں۔

انھیں ڈھونڈھ نکالئے۔ ہوشیاری سے نکتے پھلا کر سونگھئے۔ ان کی بو

ملک کے کونے کونے سے خود دودھی آئے گی اور بس ناک کی سیدہ میں دودھ کر
 انہیں پکڑ لیجئے اور پھر..... انجنیں قائم کیجئے، جلسے کیجئے، لکچر دیجئے،
 رزولوشن پاس کر ایسے۔ ان کے خلاف پروٹیکشنڈے کا ایسا جال بچائیے کہ
 قدم قدم پر منہ کے بل گریں، ان کے اخبار جلا دیجئے۔ پرس بند کر دیجئے۔ ان
 کی پیشانیوں پر سرخ لوہے سے بالشویک داغ دیجئے۔ یہ لوگ بالشویک ہیں
 گویا جانتے نہیں۔ ان کی تحریروں پر دفعت لگائیے۔ مقدموں کے ذریعے
 پتھیاں دے کر پست کر ڈالئے۔ تاج شاہی کی مدولے کر چہروں میں گھسیٹئے اور
 یہ جہاں ملیں جب ملیں، ان کو تباہ کر دیجئے۔ اگر غلطی سے یہ عوامی تھیٹر آپ کے
 شہر میں پروگرام پیش کرنے آئے تو تمام بااثر، رؤسا، علماء دین اور سرکاری افسروں
 کی مدد حاصل کر کے اس کا مقصد تہ و بالا کر دیجئے۔ ہال کے باہر کپٹنگ کیجئے اور
 اندر دنگا مچائیے۔ اسٹیج پر اتنا اودھم مچائیے کہ طبل جنگ کی پکار دہیں یتیم مردہ
 ہو کر سسکنے لگے، ورنہ یاد رکھئے اگر یہ کوئی گرج ایک باری پود کے کچے کاؤں میں
 گونج گئی تو وہ اسے برداشت نہ کر سکیں گے، اور آج جو تلاطم میں نے راج کے
 سینے میں مچلتے دیکھا ہزاروں معصوم سینوں کو تہ و بالا کر دے گا، وہ ننگی تلواریں
 جو آج میں نے راج کی آنکھوں میں ناچتی دیکھیں لاکھوں شریف آنکھوں میں
 جگمگا اٹھیں گی۔

میں آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ بات مہنسی میں ٹالنے کی نہیں، ایسا نہ ہو کہ
 اس وقت تو آپ مجھ کو احمقوں کی فہرست میں لگا دیں اور پھر ایک وقت ایسا
 آئے کہ آپ کو دستِ تاسف ملنا پڑے، پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ چڑیاں کھیت کا کھیل

کر چکی ہوں گی اور وقت لہراتے ہوئے سانپ کی طرح بغیر لکیر چھوڑے بھاگ چکا ہوگا
پھر اس وقت آپ کتنا ہی پچتا میں، نادوم ہوں، مجھے یاد کریں، میرا محبوبہ بنوا کر
شاہراہ عام پر کھڑا کر دیں، کچھ بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ دیکھیے اگر یہ لال چوبیسے موجودہ نظام
کے جسم کو ایک دفعہ پٹ گئے تو اس جہنم میں تو نہ چھوڑیں گے اور پھر یہ بھیا ناک
زخم کسی مرہم سے پُر نہ ہو سکے گا۔

لیکن اگر عوامی تھیٹر کسی نہ کسی طرح اپنا پروگرام دکھانے پر تل ہی
جائے تو جبردار ٹکٹ ہرگز نہ خریدیے گا اور نہ کسی کو خریدنے دیجیے گا۔ ہاں اگر
مفت کا پاس مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ پروگرام ان کمبختوں کا واقعی
ذرا دلچسپ ہے۔ خاص طور پر پریتی سرکار روہیلی ندی کی طرح لہراتی، بل کھاتی،
تھڑکتی، انقلابی آواز۔ بنوے کی اتھاہ سمندر جی گہری گونجتی، گر جتی، ابھرتی ڈوبتی
تائیں اور ریتیا کی برساتی تھرنوں کی طرح چھم چھم کرتی، میٹھی میٹھی مرکبیاں تھوڑی دیر
کے لئے انسان کو..... لا حول ولاقوة۔ میں پروگرام پسند کرتے کرتے بچی۔

بھونی مونی

آرام کرسی ریل کے ڈبے سے لگا دی گئی اور بھابی جان نے قدم اٹھایا
 "اکہی خیر!..... یا غلام دستگیر..... بارہ اماموں کا صدقہ۔ بسم اللہ بسم اللہ
 بیٹی جان سنبھل کے قدم مقام کے پانچہ اٹھا کے
 سبج سبج" بی مغلانی نقیب کی طرح لکھاریں۔ کچھ میں نے گھسیٹا کچھ بھابی صاحبے
 مٹھیلا۔ تعویذوں اور امام ضامنوں کا اشتہار سنی بھابی جان تنے ہوئے غبارے
 کی طرح ہانپتی سیٹ پر لڑھاک بیٹھیں۔

"پاک پروردگار تیرا شکر" بی مغلانی کے منہ سے اور ہمارے دلوں سے نکلا
 بغیر ہاتھ پیر ہائے ہانپ جانے کی عادت شاید وہ ساتھ لے کر تو پیدا نہ ہوئی ہونگی اور
 نہ انادوں، دایاؤں کی لاڈ بھری گودوں میں انکا اچار پڑا۔ پھر بھی اوسط درجے کی خوبصورت
 دلی چلی رٹ کی چند ہی سال میں بھپھو لے کی طرح نازک بن گئی۔ بات یہ ہوئی کہ سیدھی
 ماں کے کوٹھے سے توڑ کر بھابی جان کے پلنگ کی زینت بنا دی گئیں اور وہاں
 ایک شگفتہ پھول کی طرح پڑے ممکنے کے سوا ان پر زندگی کا اور کوئی بار نہ پڑا۔ بی مغلانی

شادی کے دن سے انھیں پالنے پوسنے پر مقرر کر دی گئیں۔ صبح سویرے یعنی جب بڑے لوگوں کی صبح ہوتی ہے۔ سلجی میں منہ دھلا کر وہیں مسہری پر جوڑا بدل کر چوٹی کنکھی سولہ سنگار کر کے بھرپور دتی کے ناشتے کا خون سامنے چن دیا جاتا جیسے صفا کڑا کے میری پھولے پھولے گلؤں والی بھابی ہتھیلی پر بٹھادی رکھے بیٹھی مسکرایا کرتی۔

لیکن یہ مسکراہٹیں شادی کے دوسرے ہی سال پھکی پڑ گئیں اور ان کا سلسلہ ہر وقت ٹھوکنے اور قے کرنے میں گزرنے لگا۔ نہکتے ہوئے پھولوں میں لدی مر پارہ کے بجائے اس روگ میں مبتلا بیوی کو پا کر بھابی جان بھی بدکنے لگی مگر اماں بیگم اور بی مغلانی کے یہاں تو جانا بہار آگئی۔ پہلے ہی مہینے سے گدیلا پوڑے اس زور و شور سے سلنے لگے جانا کل ہی برسوں میں زچگی ہونے والی ہر مارے تقویذوں کے جسم پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، اے دن کے ٹوٹنے ٹٹکے دم بولانے لگے۔ ویسے ہی بھابی جان کے دشمن کاہے کو چلنے پھرنے کے شوقین تھے اب تو بس کڑوٹ بھی لیں تو مغلانی بی انشر سبم ابتر کے جو جو کاروں سے گھر سر پر اٹھا لیتیں اور بس دن بھر وہ کچے گھرے کی طرح سینت کر رکھی جاتیں۔ صبح شام پیر فقیر دم درو و کرنے اور پھونکیں مارنے آتے۔

لیکن باوجودیکہ مغلانی کا پرہ سخت تھا، کچا گھڑا وقت سے پہلے ہی کھل گیا اور اراموں پر پانی پھر گیا۔ ڈال پھر خالی رہ گئی۔ بڑا جھڑ گیا۔ پر جان بچی لاکھوں پائے، انڈا اور دے گا۔ گھر کی دولت ہے۔ انڈا نے ادھر دیا۔ پرہ پہلے سے چوگنا ہو گیا۔ مگر پھر ہاتھ خالی۔ تیسری دفعہ تو معاملہ ذرا قابل غور بن گیا۔ مارے دواؤں کے

بھابی جان کا پیٹھن کھل گیا۔ رنگ ایک سرے سے غائب۔ صرف بھولی بھولی
 اُلی ہوئی شکر تیز جیسی رہ گئیں۔ بھائی جان کی شام رات کے بارہ بجے ہونے لگی
 بی مغلائی اور اماں بیگم کے تئیں بھی ذرا چڑھنے اُترنے لگے اور بھابی جان کو مہر
 پر پڑے پڑے بھائی جان کی دوسری شادی کے شادیانے سنائی دینے لگے۔
 اور حب اللہ اللہ کر کے بھر وہ دن آیا تو پیروں، مریدوں کے علاوہ
 دہلی کے ڈاکٹر بھی اپنے سارے تیر تھنگ لے کر تعنات ہو گئے۔ خدا کے کرم سے
 انگنا مہینہ لگا اور بھابی جان صابن کے بلبلے کی طرح رونی کے پھولوں پر رکھی
 جانے لگیں۔ کسی کو قریب کھڑے ہو کر پھینکنے یا ناک شکنے کی بھی اجازت نہ تھی
 مبادا رد عمل سے بلبلہ شق نہ ہو جائے۔

اب ڈاکٹروں نے کہا خطرہ کھل گیا تو اماں بیگم نے بھی سوچا کہ زچگی علیگڑھ
 ہی میں ہو۔ ورنہ اساتو سفر ہے۔ گو بھابی جان دلی چھوڑتے لرزتی تھیں۔ جہاں کے
 ڈاکٹروں نے انکا اتنا سفر صحیح و سالم کٹوا دیا تھا۔ اب انکھوں کی سوئیاں ہی تو
 رہ گئی تھیں۔ دوسرے وہ زمانے کے تئیں دیکھ رہی تھیں، اگر اچکے دار خالی گیا
 تو بھابی جان کو ان کے سینے پر سوت لانے میں کوئی بہانہ بھی آرہے نہ رہے گا
 اب تو وہ نام چلانے والی آرہی تھیں کہ سب کچھ کر سکتی تھیں۔ خبر نہیں بیچارے کو اتنا
 اپنا نام مذہر رکھنے اور اُسے چلانے کی کیوں فکر پڑی تھی حالانکہ خود ان کا کوئی ادب یا
 نام تھا ہی نہیں۔ دنیا میں۔ مسہری کی زینت کا جو ایک اہم فرض ہے، اگر وہ
 بھی نہ پورا کر سکیں تو یقیناً انھیں سکھ کی سیج چھوڑنا پڑے گا۔ یہ چند سال نوجوانی
 اور حسن کے بل بستے پر وہ ڈٹی رہیں، پر اب تو ذرا سخت کے پائے ڈلگاتے

جا رہے تھے اور وہ انھیں الٹ دینے کو تیار تھا اور پھر اس تخت سے اتر کر بے چاری کے پاس دوسری جگہ کہاں تھی۔ سینا پر زنا تو افسوس۔ نے سیکھا اور نہ اس میں جی لگے دو بول پڑھے تھے، سو وہ بھی بھول بھال گئی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں اگر ان کا کوئی کھلانے پلانے والا نہ رہے تو وہ ہر دن ایک کام اختیار کر سکتی ہیں۔ یعنی وہی خدمت جو وہ بھائی جان کی کرتی تھیں خالق خدا کی کریں۔

لہذا وہ جی جان سے اس بار ایک ایسا ہتھیار مہیا کرنے پر تلی ہوئی تھیں جس کے سہارے ان کے کھانے پینے کا انتظام تو ہو جاتا۔ یا سپ نہ سہی واوا واوی تو پالیں گے ہی۔

زبردست کا ٹھینکا سر پر۔ اماں بیگم کا تادر شاہی حکم آیا اور ہم لوگ یوں لدے پھندے علی گڑھ چل پڑے۔ نئے نقویں اور ٹونکوں سے لیس ہو کر بھابی جان میں بھی اتنی ہمت ہو گئی

”الٹی خیر“ بی منگانی اکھن کی ٹکر سے بے خبری میں دھڑام سے گریں اور بھابی جان نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھوں سے گھڑا دیوچ لیا۔

”ہے ہے یہ گاڑی ہے کہ بلا چلا الہی پیروں کا صدقہ..... اے شکل کشا“ بی منگانی بھابی جان کا پیٹ مقام کر بڈگد کر کے درود اور کلام پاک کی آیتیں پڑھنے لگیں۔ خدا خدا کر کے فانی آباد آگیا۔

طوفان میل کا نام بھی خوب ہے۔ وندانی چلی جاتی ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ڈپہ پورا اپنے لئے ریند رو تھا۔ بھیڑ بھاڑ کا خدشہ ہی نہ تھا۔ میں کھڑکی کے سامنے والی گاڑی میں بھری ہوئی مخلوق کے مطالعے میں متواور بی

مغلانی انجن کی سیٹی کے خوف سے کان بند کئے بیٹھی تھیں۔ بھابی جان کو تو دور ہی سے بھڑک کر دیکھ کر جکڑا گیا اور وہ وہیں پڑی رہ گئیں۔ جوں ہی ریل کی ڈبہ کا دروازہ کھلا اور ایک گنوار می گھسنے لگی۔ قلی نے بہتیرا گھنٹا، مگر وہ چلتی ریل کے پائیدان پر ڈھیبٹ چھپکلی کی طرح لٹا گئی اور بی مغلانی کی "ہیں ہیں" کی پرواہ نہ کر کے اندر رینگ آئی اور غسل خانے کے دروازے سے پیچھے لگا کر ہانپنے لگی۔

"اے ہے موئی تو ہے" بی مغلانی منمنائی "اے نگوڑی کیا پورے دن سے ہے؟"

ہانپتی ہوئی بیدم عورت نے اپنے پٹریاں جھے ہونٹوں کو مشکل مسکراہٹ میں پھیلایا اور اثبات میں سر ہلایا۔

"اے خدا کی سنوار ویدہ تو دیکھو سردار کا.... تو بے اثر تو ہے" اور وہ باری باری اپنے گالوں پر حقیر مارنے لگیں۔

عورت نے کچھ جواب نہ دیا صرف ورد کی شدت سے تڑپ کر غسل خانے کا دروازہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ساکن اوپرے ترتیب ہو گیا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے ٹھنڈی مٹی پر اوس کی بوندوں کی طرح پھوٹا آئے۔

"ار می کیا پہلو بھٹی کا ہے؟" بی مغلانی نے اس کے اٹھڑپن سے خوفزدہ ہو کر کہا اور اس بار کرب کا ایسا حملہ پڑا کہ وہ جواب ہی نہ دے سکی۔ اس کے چہرے کی ساری رگیں کھینچنے لگیں، لمبے لمبے آنسو اس کی ابلی ہوئی آنکھوں سے پھوٹ نکلے۔ بی مغلانی ہے ہے، اوئی، ہائے، کرتی رہیں اور وہ درد کی لہر کو گھونٹتی

وہی میں بسو رہی تھی اور بھابی جان سسکیاں لے رہی تھیں
 "اے ہے بی کنواری می کیا منے سے بھیجی دیکھ رہی ہو۔ اے بیٹی ادھر منہ
 کے بیٹھو" اور کنواری نے جلدی سے منہ اُدھر کر لیا۔ پھر چوں ہی درد کی لہر سے
 تڑپ کر اُس نے آواز نکالی گردن قابو میں نہ رہ سکی، اور بی مغلائی نے صلواتیں
 سنانی شروع کیں "ادھ تو بہ جیسے ایک بچے کو دنیا میں داخل ہوتے دیکھ کر میرا
 کنواریں مسخ ہی تو جلے گا۔ بھابی جان دوپٹہ منہ پر لپیٹے بسو رہی تھیں۔ بی
 مغلائی ناک پر برقعہ رکھے حنی خنی ہنسی رہی تھیں اور ریل کے فرش کی جان کو
 رو رہی تھی۔

ایک دم ایسا معلوم ہوا ساری دنیا سکر کر کھڑی ہو گئی۔ فضا گھٹ کر
 پیڑھی میڑھی ہو گئی۔ شدت احساس سے میری کنپٹیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح
 اکڑ گئیں اور بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ میں نے سوچا عورت اب مری اور
 اب مری کہ ایک دم سے فضا کا تشنج رک گیا۔ بی مغلائی کی ناک کا برقعہ پھیل پڑا
 اور بالکل بھابی جان کی سلیم شاہی جوتیوں کے پاس لال لال گوشت کی بوئی آن
 پڑی۔ حیرت اور مسرت کی ملی جلی چیخ میرے منہ سے نکلی اور جھباک کر اس ننھی سی
 کائنات کو دیکھنے لگی جس نے اپنا لمبا چوڑا دہانہ کھول کر ہائے توبہ ڈال دی۔

بی مغلائی نے میری چوٹی پکڑ کر مجھے کونے میں ٹھونس دیا اور اس عورت
 پر گالیوں اور ملامتوں کا طومار لے کر ٹوٹ پڑیں۔ میں تے سیٹ کے کونے سے
 آنسوؤں کی چلن سے جھانک کر دیکھا تو وہ عورت مری نہ تھی بلکہ اس کے سوا کچھ
 اہلئے ہونٹ جھنپیں اس نے چبا ڈالا تھا۔ آہستہ آہستہ سکراہٹ میں چل رہی تھی

اس نے ننھے سے سائل کی واویلا سے بے چین ہو کر آنکھیں کھول دیں۔ آرمی ہو کر اس نے اسے اٹھالیا۔ کچھ دیر وہ اپنے نا تجربہ کار ہاتھوں سے اسے صاف کرتی رہی۔ پھر اس نے اور ڈھنسی سے دھبی بھاڑ کر نال کو کس کر بازو دیا۔ اس کے بعد وہ بے کسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ مجھے اپنی طرف مخاطب دیکھ کر وہ ایک دم کھل کھلا کر ہنس پڑی "کوئی پھری چکے ہے بی بی جی؟"

بی منگانی گالیاں دیتی رہ گئیں۔ بھابی جان نے بسور کر میرا نخل کھینچا پر میں نے ناخن کاٹنے کی پتلی سے پکڑا دی۔

اس کا سن میرے ہی اتنا ہو گا یا شاید سال چھ مہینے بڑی ہو۔ وہ اپنے اٹھنا تجربہ کار ہاتھوں سے ایک بچہ کا نال کاٹ رہی تھی جو اس نے چند منٹ پیشتر جنما تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ بھیڑ بکریاں یاد آنے لگیں جو بغیر دانی اور لیٹی ڈاکر کی مدد کے گھاس چرتے چرتے پیرٹلے زچہ خانہ رمالیتی ہیں اور نوزائیدہ کو چاٹ چاٹ کر قصہ ختم کرتی ہیں۔

بزرگ لوگ کنواری لڑکیوں کو بچہ کی پیدائش دیکھنے سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زیب النساء نے اپنی بہن کے اہل بچہ پیدا ہوتے دیکھ لیا تھا تو وہ ایسی ہیبت زدہ ہوئی کہ ساری عمر شادی ہی نہ کی۔ شاید زیب النساء کی بہن میری بھابی جان جیسی ہوگی، ورنہ اگر وہ اس فقیرنی کے بچہ پیدا ہوتے دیکھ لیتی تو میری ہی ہم خیال ہو جاتی کہ سب ڈھونگ رچاتے ہیں۔ بچہ پیدا کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا بھابی جان کے لمے ریل پر سوار ہونا یا اترنا۔

اور مجھے تو کچھ ایسی بھیا ناک قسم کی شرم کی بات بھی نہ معلوم ہوئی۔ اس سے

کہیں زیادہ ہیودہ بائیں بی مغلائی اور آماں ہر وقت مختلف عورتوں کے پاس
میں کیا کرتی تھیں جو میرے کچے کانوں میں جا کر مجھے معنوں کی طرح بھونکا کرتی تھیں۔
تھوڑی دیر تو وہ پھوٹن سے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کرتی رہی۔ آنسو
خشاں ہو چکے تھے اور وہ کنبھی کنبھی منہس رہی تھی جیسے اُسے کوئی گدگدار ہو۔ پھر
بی مغلائی کے ڈانٹنے پر وہ سہم گئی اور بچے کو چیتھڑوں میں لپیٹ کر الگ سیٹ
کے نیچے رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بھابی جان کی چیخ نکل گئی۔

اتنے میں بی مغلائی بھابی جان کو ٹوٹتی سہلاتی رہیں۔ اس نے باختر روم
سے پانی لا کر ڈبہ کو صاف کرنا شروع کیا۔ بھابی جان کی زرکار سلیم شاہی دھوپوچھ
کر کونے سے لگا کر کھڑی کر دی۔ پھر اس نے پانی اور چیتھڑوں کی مدد سے ذبہ سے جملہ
زچگی کے نشانات دور کر ڈالے۔ اتنے اہم تینوں مقدس بی بیاں سیٹوں پر لدی
احمقوں کی طرح اسے دیکھتی رہیں۔ اس کے بعد وہ بچہ کو بھاتی سے لگا کر باختر روم کے
دروازے کے سہارے مو بیٹھی جیسے کوئی گھر کا مولی کام کاج کر کے جی بہلانے فرصت
سے بیٹھ جائے اور چنے چباتے چباتے اد نگھ گئی۔ خورجہ پر گاڑی کے دھچکے سے وہ چونکا
پڑی۔ گاڑی رکتے رکتے اس نے ڈبے کا دروازہ کھولا اور پیر تو لیتی اتر گئی۔

ٹکٹ چکر نے پوچھا "کیوں ری ٹکٹ؟" اور اس نے مسرت سے
بے تاب ہو کر جھولی بھیلادی جیسے وہ کہیں سے جھڑبیری کے بیر چرا کر لائی ہو۔ ٹکٹ چکر
منہ پھاڑے کھڑا رہ گیا۔ اور وہ منہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی بیٹری میں گم ہو گئی۔
"خدا کی سنواران خانگیوں کی صورت پر۔ یہ حرامی حلالی جنتی پھرتی ہیں
موئی جا دو گرنیاں" بی مغلائی بڑبڑائی۔ ریل نے ٹھوکر لی اور چل پڑی۔

بھابی جان کی سسکیاں ایک منظم چیخ میں اُبھر آئیں "بے ہے مولا
خیر تو ہے بیگم وطن ! " بی مغلائی ان کا متغیر چہرہ دیکھ کر لرزیں۔
اور وہاں خیر غائب تھی !

اور بھابی جان کے ہونٹ چہرے پر بھائی جان کی دوسری شادی کے تاشے باجے
خزاں برسانے لگے :-

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمت
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام روگیا
نئی روح دنیا میں قدم رکھتے بھجک گئی اور منہ بسور کر لوٹ گئی۔ میری
بہن چھلارانی نے جو طلسم ہوش ربا قسم کی زچگی دیکھی تو مارے ہیبت کے چل کر گیا۔

آزادی کے بعد

۲۱

ہاورڈ فاسٹ

یہ ناول امریکی حبشیوں کی جنگ آزادی کی ایک ایسی تصویر ہے جس کے خط وخال دلکش بھی ہیں اور سمیت ناک بھی۔ اس میں انسانوں کی ان آرزوؤں اور تباہیوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جو ہاتھیں بندوق لیکر اور اپنا خون بہا کر اپنی تکمیل کے لئے کوشاں ہوئی ہیں۔

ہاورڈ فاسٹ نے اپنے جادو بھرے قلم سے امریکی رجعت پرستی کے چہرے کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ وہ اپنی بھیانک صورت چھپا نہیں سکتا۔ اور ترقی اور انسانیت کے حُسن کو وہ تانہا کی بخشی ہے جو کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ آج جب ساری انسانیت اپنی آزادی کی اسخسری منزل کے قریب پہنچ گئی ہے اس ناول کا مطالعہ بہت ضروری اور حوصلہ افزا ہے۔

سائز ۱۸ x ۲۲ — صفحات ۳۲۳ — مضبوط جلد — خوبصورت گرد پوش

قیمت پانچ روپے آٹھ آنہ — (ہیر)

کتیب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی